بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اسرار احمد

تذکرہ و تبصرہ

میڈیکل کالج لاہور میں اپنے پانچ سالہ عرصۂ تعلیم کے دوران راقم الحروف نے معمارِ پاکستان محمد علی جناح مرحوم کا حسبِ ذیل فقرہ جو کالج ہال کی دیوار پر نہایت جلی حروف میں لکھا ہوا تھا، بلا مبالغہ سیکڑوں مرتبہ پڑھا ہوگا۔

> "GOD HAS GIVEN US A GOLDEN OPPORTUNITY TO SHOW OUR WORTH AS ARCHITECTS OF A NEW NATION (OR STATE?) AND LET IT NOT BE SAID THAT WE DID NOT PROVE EQUAL TO THE TASK !"

یعنی "مملکتِ خداداد پاکستان کی صورت میں) اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک نئی قوم (یا مملکت!) کے معماروں کی حیثیت سے اپنی اہلیت وصلاحیت کے اظہار کا ایک سنہری موقع عطا فرمایا ہے اور دیکھنا: ایسا ہرگز نہ ہو کہ دنیا یہ کہے کہ ہم اس عظیم کام کے اہل ثابت نہیں ہو سکے!"

پھر کچھ تو اس بنا پر کہ فقرہ بجائے خود نہایت جاندار تھا اور اس کے الفاظ کا در و بست نہایت موزوں تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان ابھی نیا نیا بنا تھا اور ہر پاکستانی مسلمان کے دل میں ایک "ولولۂ تازہ" موجزن تھا اور اس جملے میں گویا ہر شخص کو اپنے ہی دل کی صدا سنائی دیتی تھی۔ یہ فقرہ کچھ اس طرح ذہن میں ثبت ہو گیا تھا کہ آج تک من و عن یاد ہے۔

لیکن ——— افسوس ——— کہ آج جبکہ پاکستان کو قائم ہوئے بائیس سال ہونے کو آئے اور خود محمد علی جناح مرحوم کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا، مملکتِ خداداد پاکستان بزبانِ حال نوحہ خواں ہے کہ اس کے بانی و مؤسس کا خدشہ صحیح ثابت ہوا اور اس نئی مملکت کو وہ معمار میسر نہ آ

ماہنامہ میثاق ۔ لاہور

مقالاتِ شامِ ہمدرد

شامِ ہمدرد کی انجمن میں روشن ہونے والی چند شمعیں ہیں ——— جو

مولانا حافظ محمد ایوب دہلوی ——— ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی
ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی ——— جسٹس ایس اے رحمان
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ——— مولانا مفتی محمد شفیع
ابو الاثر حفیظ جالندھری ——— اے کے بروہی
چودھری نذیر احمد خان ——— حکیم عبد اللطیف فلسفی
حکیم محمد سعید دہلوی ——— میاں ایم اسلم
جوش ملیح آبادی ——— مولانا صلاح الدین احمد
ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ——— کرنل مجید ملک
مولانا امین احسن اصلاحی ——— ڈاکٹر عبد السلام خورشید
حکیم احمد شجاع ——— اور ——— محمد ولی اللہ خان

جیسے نادرۂ روزگار [illegible] شعرا، ماہرینِ تعلیم اور قانون دانوں نے روشن کی ہیں اور جن کی روشنی سے ارضِ پاک کے آفاق صدیوں تک منور رہیں گے۔
بڑے سائز کے ۳۰۰ صفحات، آرٹ پیپر پر ۲۰ تصاویر، آفسٹ طباعت
قیمت: کاغذی جلد ۷/۵۰ ——— مجلد خاص ۱۵/-

پاکستانی ثقافت کا ایک عظیم الشان منبر

شامِ ہمدرد

جہاں

ہمارے سربرآوردہ اہلِ علم اور اہلِ عمل
تبادلۂ خیال کرتے ہیں ———
اور دانشوروں کی انجمن میں نت نئی
شمع روشن کرتے ہیں ———

مکتبۂ جدید

۴ ۔ شارع فاطمہ جناح، لاہور

سکے جو ایک انگریز شاعر کے قول کے مطابق "اس کے ستونوں کو نہایت گہری اور پختہ بنیادوں سے اٹھاتے اور پھر تعمیر کرتے ہوئے اوجِ ثریا تک پہنچا دیتے!"[؎] ـــــــ بائیس سال گزر جانے کے بعد بھی اگر کسی مملکت کا "اساسی نظریہ" تک زیرِ بحث چلا آ رہا ہو اور دستور سازی ہنوز معرضِ بحث میں ہو بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے بارے میں نئی نئی بحثیں اٹھ رہی ہوں اور ردّ و قدح اور تکرار و نزاع کی نت نئی صورتیں پیدا ہو رہی ہوں، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ساری مادّی ترقیوں اور معاشی منصوبہ بندیوں کے باوجود ابھی مملکت کی اصل تعمیر کی ابتدا بھی نہیں ہوئی۔ اور قومی تعمیرِ نو کا کام شروع بھی نہیں ہو سکا۔

پاکستان کی زندگی کے بائیس سال درحقیقت گیارہ گیارہ سالوں کے دو مساوی ادوار پر مشتمل ہیں۔ پہلے گیارہ سالوں (۱۹۴۷/۵۸ء) کے دوران پاکستان کے سیاست دانوں کی نااہلی و ناقابلیت کا تدریجی ظہور ہوا اور اس کے اختتام کے قریب قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور شخصیتیں اس عظیم مملکت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں بالکل ناکام ہو چکی ہیں اور ان کے ہاتھوں اب کسی خیر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی ـــــــ اس کے فطری نتیجے کے طور پر ۱۹۵۸ء میں ایک انقلاب آیا جو بظاہر اور ابتداءً تو فوجی تھا لیکن بہت جلد اس نے ایک سابق فوجی کے زیرِ سرپرستی ایک خالص نوکرشاہی کی صورت اختیار کر لی اور اہلِ سیاست کو میدان سے ہٹا کر مملکت کے دوسرے منظم ادارے یعنی سول سروسز نے ملک کے نظم و نسق کو سنبھال لیا۔ چنانچہ دوسرا دور (۱۹۵۸/۶۹ء) درحقیقت بیوروکریسی کا دور تھا اور اس کے دوران قوم کے اس دوسرے طبقے کی بھی بھرپور آزمائش ہو گئی۔ لیکن افسوس کہ اس دور کے بالکل ابتدا ہی سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا کہ قوم کا یہ طبقہ بھی دیانت و امانت اور احساسِ فرض کے ان اوصاف سے بہت حد تک عاری ہے جو اس عظیم ذمہ داری کو کما حقہٗ ادا کرنے کے لئے لازمی ہیں جو اس کے کندھوں پر آ پڑی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس طبقے کی نااہلیت بھی واضح ہوتی چلی گئی اور ۱۹۶۸ء کے اواخر میں بے اطمینانی کا وہ لاوا جو قوم کے مختلف طبقات میں اس طبقے کی دست درازیوں کے باعث کھول رہا تھا اچانک پھٹ پڑا ـــــــ اور اس طرح یہ دور بھی دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔

ان دونوں طبقات کی ناکامی کے بعد ـــــــ ملک و ملت کے پاس ایک ہی منظم ادارہ باقی رہ گیا ہے یعنی فوج، چنانچہ بدرجۂ مجبوری پھر اسی کو آگے بڑھ کر ملک و ملت کی زمام اپنے ہاتھ میں لینی پڑی ہے

[؎] "THEY BUILD A NATION'S PILLARS DEEP,
AND LIFT THEM TO THE SKY!"

اور خدا کا شکر ہے کہ شرافت، دیانت، امانت، حبِ وطن، حبِ قوم، ایثار، قربانی، احساسِ فرض اور تن دہی و جان فشانی کے اوصاف کے اعتبار سے قوم اپنے اس طبقے پر مکمل اعتماد بھی کرتی ہے ـــــــ لیکن ظاہر ہے کہ اس ادارے کا اصل فریضہ دفاعِ وطن ہے اور یہ بجائے خود اتنی عظیم ذمہ داری ہے کہ اس پر کوئی مزید بوجھ ڈالنا حد درجہ ناانصافی ہے۔ بین الاقوامی حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس کے پیشِ نظر مستقبل میں دفاعِ وطن کی ذمہ داری یقیناً پہلے سے بھی کہیں زیادہ بھاری اور بوجھل ہو جائے گی اور ڈیفنس سروسز کے کندھوں پر اگر زیادہ دیر تک ملک کے داخلی نظم و نسق کا بوجھ بھی پڑا رہا تو اس سے دفاعِ وطن کے محاذ کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے اور یہ خطرہ (RISK) اتنا بڑا ہے کہ اسے کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف ملک کی سیاسی جماعتوں اور شخصیتوں کی صفوں میں خاصی سرگرمی اور ہلچل کے باوجود تاحال کوئی ایسی صورت سامنے نہیں آ رہی ہے کہ یہ امید کی جا سکے کہ اگر حکومت ان کے حوالے کر دی جائے تو یہ اطمینان بخش طور پر اسے سنبھال سکیں گی اور دوبارہ وہی صورتِ حال پیدا نہ ہو جائے گی جس کے پیشِ نظر مارشل لاء کا نفاذ لازمی ہو گیا تھا۔

الغرض ـــــــ نظریاتی اور دستوری بحثوں اور مناقشوں پر مستزاد یہ ہے وہ نازک صورتِ حال اور عظیم الجھاؤ (DILEMMA) جس سے مملکتِ خداداد پاکستان اس وقت دوچار ہے۔

اس صورتِ حال کے اسباب میں سے تین عوامل تو ہماری گذشتہ نصف صدی کی تاریخ سے متعلق ہیں اور تین پیچیدگیاں وہ ہیں جو قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہو گئیں اور مسلسل بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔

تاریخی عوامل کے بارے میں ہم ان صفحات میں مفصل لکھ چکے ہیں اور یہاں ان کے مفصل اعادے کی گنجائش بھی نہیں۔ مختصراً وہ یہ ہیں کہ:-

اوّلاً ـــــــ آج سے تقریباً نصف صدی قبل ملتِ اسلامیہ ہند و پاک کی قوتیں اور توانائیاں منقسم ہو گئیں اور وقتی لائحہ عمل اور پالیسی سے اختلاف کی بنا پر علماء کا وہ طبقہ جو ماضی میں قوم کا اصل رہنما رہا تھا اور جس میں مخلص اور بے لوث علماء کی کافی بڑی تعداد بھی موجود تھی اپنے متوسلین سمیت قوم کے سوادِ اعظم سے کٹ کر رہ گیا اور اس طرح قوم اپنی بہترین متاع سے محروم ہو گئی۔ رہا یہ سوال کہ یہ حادثہ کیسے اور کیوں واقع ہوا؟ تو یہ ایک علیحدہ مستقل موضوع ہے جس پر گفتگو کی اس وقت گنجائش نہیں (ویسے ہم میثاق مارچ ۱۹۶۷ء کے "تذکرہ و تبصرہ" میں اس موضوع پر مفصل کلام کر چکے ہیں!)

ثانیاً ـــــــ اسلامیانِ ہند کی قومی قیادت قومی تعمیرِ نو اور قوم کی تنظیم و تربیت کے ضمن میں ہرگز کوئی

قابل ذکر کام نہیں کر سکی۔ اب چاہے یہ کہہ لیا جائے کہ اسے اس کا وقت نہیں ملا، چاہے یہ کہ اس نے اس کی جانب توجہ نہیں کی، فرق کوئی واقع نہیں ہوتا۔ اور واقعہ بہرحال یہی ہے کہ قومی تحریک نے بس ایک ہنگامی اور فوری سی ضرورت کو تو ضرور پورا کر دیا لیکن اس نے قوم کو نہ کوئی قومی تنظیم دی نہ قومی قیادت!

ثالثاً ——— قیام پاکستان سے تقریباً ایک دہائی قبل ایک اور صاحب نے 'قومی تحریک' کو مطعون کر کے ایک 'بین الاقوامی' اور خالص اصولی اسلامی تحریک کے نام پر قوم کے جسد سے مخلص کارکنوں کا ایک دستہ کاٹ لیا، اور قیام پاکستان کے فوراً بعد اسی 'ٹکڑی' کی مدد سے "اسلامی دستور" اور "انقلاب قیادت" کے نعروں کے ساتھ قومی قیادت پر ایک زوردار شبخون مارا ——— نتیجۃً قومی قیادت کے رہے سہے مخلص عناصر کو قیام پاکستان کے فوراً بعد ایک جانب قومی تنظیم کے اندرونی خلفشار کا سامنا کرنا پڑا اور دوسری طرف ان صاحب کی بیرونی یلغار کا۔ اس دوگونہ کشمکش نے قومی قیادت کے ان مخلص عناصر کو کمزور کرتے کرتے بالآخر بالکل میدان سے خارج (KNOCK OUT) کر دیا اور میدان بالکلیہ ان لوگوں کے ہاتھ آ گیا جن کا کوئی دین تھا تو خالص اغراض پرستی اور ایمان تھا تو محض مفادات پر، اور جو کبھی یونینسٹ ہوتے تھے، کبھی لیگی، پھر کبھی ری پبلکن بن جاتے تھے اور کبھی پھر لیگی! ——— ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں پاکستان کی قومی سیاست کے تابوت میں وہ آخری کیل ٹھکی جس کے بعد خالص بیوروکریسی کا دور شروع ہو گیا۔

ان تینوں تاریخی عوامل پر مستزاد ہیں وہ تین پیچیدگیاں جو قیام پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہو گئی تھیں اور گویا پاکستان کی تعمیر ہی میں مضمر ہیں اور جن کا الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے ——— آئندہ ہم ان کے بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین پیچیدگی خالص جغرافیائی ہے یعنی یہ کہ مملکت خداداد پاکستان دو ایسے علٰحدہ اور دور دراز خطوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے پر واقع ہوئے ہیں اور جن کے مابین ایک ایسی مملکت حائل ہے جو حالت جنگ ہی میں نہیں عین حالت امن میں بھی ایک بالقوۃ دشمن (POTENTIAL ENEMY) کی حیثیت رکھتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یوں تو خود پاکستان کا وجود ہر اعتبار ہی سے ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن خاص اس اعتبار سے تو یہ تاریخ عالم کا ایک نہایت ہی انوکھا اور غیر المعقول تجربہ ہے جس کی شاید ہی کوئی دوسری نظیر کبھی موجود رہی ہو۔

یہ جغرافیائی پیچیدگی بجائے خود بھی کچھ کم اہم اور الجھی ہوئی نہ تھی۔ لیکن دو مزید عوامل نے اس کے الجھاؤ کو دوگونہ کر دیا ہے ——— یعنی ایک اس حقیقت نے کہ تہذیب، تمدن، زبان، لباس، طرز بود و باش

اور جذباتی و ذہنی ساخت غرض ایک مذہب کے سوا ہر اعتبار سے ان دو خطوں کے رہنے والے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور اگر دین و مذہب کے سوال کو خارج از بحث کر دیا جائے تو دنیا کے مروجہ معیارات میں سے کسی معیار کے اعتبار سے بھی انہیں ایک قوم قرار نہیں دیا جا سکتا ——— اور دوسرے اس واقعے نے کہ ان دو خطوں میں سے جو خطہ رقبہ، محل وقوع، وسائل اور تعمیر و ترقی کے امکانات، الغرض تمام اعتبارات سے اہم تر ہے، وہ بلحاظ آبادی کم تر ہے اور دوسرا خطہ جو نہ صرف یہ کہ ان تمام اہم امور کے اعتبار سے بہرحال ثانوی حیثیت رکھتا ہے[1] بلکہ ایک نہایت جاندار، فعال، سرمایہ دار اور تعلیم یافتہ غرض ہر اعتبار سے نہایت مؤثر لیکن پاکستان کے اساسی نظریے کی دشمن اور اس کے عین وجود سے بغض و عداوت رکھنے والی اقلیت کی اضافی پیچیدگی بھی لئے ہوئے ہے، تعداد نفوس انسانی کے لحاظ سے دوسرے خطے سے برتر ہے ——— ذرا دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دو اضافی عوامل کی بنا پر اس خالص جغرافیائی اشکال نے ایک نہایت پیچیدہ مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے

> اور یہ اسی پیچیدگی اور اشکال کا نتیجہ ہے کہ بائیس سال کی طویل مدت میں بھی پاکستان کا کوئی دستور نہیں بن سکا اور دستور سازی کے میدان میں نہ صرف یہ کہ ہنوز روز اول کا معاملہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دور دور تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور الجھاؤ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے!!!

اس اشکال اور الجھاؤ کا مستقل حل تو ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دینی جذبات اور ملی احساسات کو مسلسل ابھارا جاتا رہے اور اس جذبے کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا۔ تاہم فوری طور پر بعض دوسری چیزیں بھی پیش نظر رہنی ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اس 'سنجوگ' کا برقرار رہنا مشرقی پاکستان کے عوام کی آزاد مرضی ہی پر منحصر ہے اور اسے کسی طرح بھی ان پر ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس معاملے میں جبر و تشدد کا ردعمل نہایت خوفناک ہو سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس 'آزاد مرضی' کا انحصار بھی جتنا کچھ دینی جذبات اور ملی احساسات پر ہے اتنا ہی اس

---

[1] ممکن ہے ہماری یہ عریاں حقیقت نگاری بعض لوگوں کو ناگوار معلوم ہو۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کوئی سیاسی کارکن اس حقیقت کے اظہار کی جرأت نہیں کرے گا، تاہم ہمارے نزدیک واقعہ یہی ہے اور اسے ذہنی طور پر قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

امر یہ بھی ہے کہ ضرورت یہ کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ہمارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو رہی بلکہ مثبت طور پر انہیں یہ احساس بھی ہو کہ خود ان کا مفاد مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے ہی سے وابستہ ہے۔ اور مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ایک دوسرے سے پیوستہ رہ کر ہی دنیا میں ایک باعزت اور باوقار آزاد مملکت کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ اگر خدانخواستہ کبھی 'علٰحدگی' کی صورت پیدا ہوئی تو مغربی پاکستان کے لئے تو پھر بھی امکان غالب موجود ہے کہ وہ اپنی آزاد اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھ سکے گا۔ لیکن مشرقی پاکستان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا کہ کسی دوسری وسیع تر قومیت میں ضم اور کسی دوسری بڑی مملکت میں جذب ہو کر رہ جائے۔

ان دو امور کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہئے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی مرضی در اصل ہے کیا! ——

اگر وہ واقعۃً مغربی پاکستان سے علٰحدہ ہو کر ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کے خواہش مند ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کی اس خواہش کے آڑے نہیں آ سکتی۔ بین الانسانی علائق میں سب سے زیادہ مقدس رشتہ میاں اور بیوی کا ہوتا ہے لیکن اس میں بھی دین فطرت نے علٰحدگی کی ایک سبیل رکھ دی ہے اور صاف ہدایت کی ہے کہ اگرچہ طلاق، حلال چیزوں میں اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے تاہم 'معلق' رکھنے سے بہتر یہی ہے کہ علٰحدگی اختیار کر لی جائے —— بالکل اسی طرح اگر ہمارے مشرقی پاکستان کے بھائی واقعۃً یہ محسوس کرتے ہوں کہ مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے میں انہیں کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے تو ان کی بے اطمینانی کے سبب سے پورے ملک کی سیاسی و دستوری زندگی کو مسلسل 'معلق' رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ان کی مرضی کو بروئے کار آنے کا موقع دے دیا جائے۔

ہم نے اوپر بھی عرض کیا تھا —— اور اب مزید وضاحت سے کہے دیتے ہیں کہ مشرقی و مغربی پاکستان کے مابین 'مساوات' کا مفہوم اگر یہ ہے کہ دارالحکومت ایک مغربی پاکستان میں ہو اور دوسرا مشرقی پاکستان میں اور مرکزی حکومت چھ ماہ وہاں رہے اور چھ ماہ یہاں، اور دفاعی اخراجات میں بھی لازماً کامل مساوات برتی جائے تو یہ خالص احمقانہ تصور ہے۔ ایسی مساوات خاندان کے مختصر سے ادارے میں بھی نہیں چل سکتی۔ کجا یہ کہ ایک عظیم مملکت جو طرح طرح کی پیچیدگیوں سے دوچار ہو، اس کے انتظام و انصرام میں برتی جا سکے۔ اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ دونوں خطے آزاد ہو کر اپنے بقا و استحکام اور تعمیر و ترقی کی فکر کریں —— !!

لیکن ہمیں یقین ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی خواہش ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ مغربی پاکستان سے علٰحدہ ہوں۔ اور اگرچہ ماضی قریب میں ان پر یہ 'بہتان' کثرت سے لگایا گیا ہے کہ ان میں 'علٰحدگی پسندی' کا رجحان موجود ہے۔ ہم یہ باور نہیں کر سکتے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان حقائق و واقعات اور موجود الوقت

ظروف و احوال سے اتنے بے خبر ہو سکتے ہیں کہ ان خطرات کا اندازہ نہ کر سکیں جو ایسی کسی تجویز میں لازماً مضمر ہیں —— ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ بس "صوبائی خود اختیاری" کے حصول کی خواہش ہے اور وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ صوبائی معاملات میں انہیں زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو اور یہ ہمارے نزدیک ان کا ایک ایسا حق ہے جس سے کسی بھی معقول انسان کو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اور مرکزی حکومت کے مؤثر طور پر اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جو امور ضروری ہیں انہیں مرکز کی تحویل میں دینے کے بعد بقیہ تمام معاملات میں مشرقی پاکستان کو کامل صوبائی خود اختیاری لازماً ملنی چاہئے۔

بنا بریں مذکورہ بالا دو امور کی روشنی میں دستور کے مسئلے پر بھی ایک بار حتمی طور پر فیصلہ کر لینے کی شدید ضرورت ہے اور تمام حالات و واقعات کا مردانہ وار مواجہہ کر کے اس مسئلے کو ایک بار قطعی طور پر طے کر لینا لازمی ہے اور اگرچہ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جن کے نزدیک کسی مملکت کے انتظام و انصرام میں اصل فیصلہ کن عامل کی حیثیت دیانت و امانت کو حاصل ہے نہ کہ قواعد و ضوابط اور تدابیر تحدید و توازن (CHECKS AND BALANCES) کے اس بے جان ڈھانچے کو جسے 'دستور' کہا جاتا ہے تاہم ہمارے یہاں جو خلاء اس میدان میں چلا آ رہا ہے اسے ایک بار جرأت و ہمت کے ساتھ عوام کی آزادانہ رائے کے مطابق پُر کر لینا ہی بہتر ہے!

دستور کے مسئلے پر ہمارے یہاں اس وقت بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں۔ بہت سے لوگ ۱۹۵۶ء کے دستور کی بحالی کے خواہاں ہیں۔ اگرچہ وہ ساتھ ہی یہ تصریح بھی کر رہے ہیں کہ اس میں بنیادی ترمیموں کی ضرورت ہے اور اگرچہ خان قیوم خان نے ایک علٰحدہ آواز بلند کی ہے یعنی یہ کہ فی الحال ایک عبوری دستور نافذ کر دیا جائے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دائیں بازو نے اپنے حلقہ اثر کی تمام جماعتوں اور شخصیتوں کو اس معاملے میں تقریباً متفق کر لیا ہے (جس کی تازہ ترین مثال شیخ مجیب الرحمن کا بھی ۱۹۵۶ء کے دستور کی بحالی سے متفق ہو جانا ہے) دوسری طرف ایک مطالبہ یہ ہے کہ بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر ایک دستور ساز اسمبلی کا انتخاب عمل میں آئے اور اسے ایک متعین مدت (مثلاً چھ ماہ) کے اندر اندر دستور سازی کا پابند کیا جائے —— بعد میں یہی اسمبلی پارلیمنٹ کی حیثیت سے کام کر سکتی ہے۔

ہمارے نزدیک یہی دوسری رائے منطق کے ہر اصول کے مطابق "اقرب الی الصواب" ہے اور اگرچہ ہمیں، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ۱۹۵۶ء کے دستور سے بھی کوئی کد نہیں۔ تاہم ہمارے نزدیک حقیقت —— یہی ہے کہ ہمارے یہاں اب تک کی کسی دستوری دستاویز کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی پشت پر عوام کی مرضی اور رائے موجود ہے۔ اور ان میں سے کسی کو بھی آئندہ انتخابات کی بنیاد بنایا گیا، تو یہ

اعتراض جائز طور پر موجود رہے گا کہ ایک غیر نمائندہ دستور کے تحت منعقد شدہ انتخابات کے نتائج بھی قابل اعتماد نہیں قرار دیئے جا سکتے ——— ہمارے نزدیک صدر مملکت محمد یحییٰ خان کی وہ رائے نہایت صحیح ہے جو انہوں نے خان قیوم خان کی متذکرہ بالا تجویز کے جواب میں ظاہر کی ہے یعنی یہ کہ موجودہ مارشل لا خود ایک عبوری دستور کی ضرورت پوری کر رہا ہے ——— اب اس معاملے میں جو اقدام بھی ہو وہ عارضی اور عبوری اور پیشگی طور پر واجب الترمیم نوعیت کا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ضرورت ہے کہ اس مسئلے کو ایک بار قطعی طور پر طے کر لیا جائے ——— اور ظاہر ہے کہ اس کی کوئی صورت اس موخر الذکر تجویز کے سوا ممکن نہیں۔

دوسری بڑی پیچیدگی جو گویا پاکستان کی تعمیر ہی میں مضمر ہے اور روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے یہ ہے کہ اپنے اوّل یوم پیدائش ہی سے پاکستان کو ایک ایسی مملکت کی عداوت و دشمنی کا سامنا ہے جو ایک طرف تو نہ صرف یہ کہ اس کے بالکل قریبی ہمسائے کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ پاکستان کے دونوں خطوں کے مابین حائل ہونے کی بنا پر گویا پاکستان کے چھوٹے سے جسم میں ایک بہت بڑے خنجر کی طرح پیوست ہے اور دوسری طرف اپنی وسعت، قوت، آبادی اور وسائل تمام اعتبارات سے پاکستان سے کم از کم چوگنی ہے[1]

> بھارت کی یہ مستقل عداوت نہ صرف یہ کہ ہمارے محدود وسائل و ذرائع پر ایک بہت بڑے بوجھ کا سبب بن رہی ہے جس کی بنا پر اس نوزائیدہ مملکت کی تعمیر و ترقی کے جملہ امکانات بروئے کار نہ آ سکے ——— بلکہ بدقسمتی سے اسی ایک مرکز کے گرد ہماری پوری خارجہ حکمت عملی کو ہمیشہ گھومنا پڑا ہے۔

اس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو گذشتہ بائیس سالوں کے دوران دو دور گذر چکے ہیں۔ اور اب تیسرے دور کا آغاز ہو رہا ہے ——— پہلا دور آرام و آسائش بلکہ عیش اور گلچھروں کا دور تھا دوسرے میں ہمیں نسبتاً مشکل تر حالات کا سامنا کرنا پڑا! اور اب جو دور شروع ہو رہا ہے آثار و قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ہمیں اپنی آزاد اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے نہایت شدید جدوجہد اور محنت و مشقت کا سامنا کرنا ہوگا۔

---

[1] اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بھارت اور اسرائیل میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ دونوں دنیا کے نقشے پر اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے بالکل خنجروں سے مشابہ ہیں۔ ایک بلاد عرب کے سینے میں پیوست ہے اور دوسرا اسلامیان پاکستان کے جسد میں ——— بلاد عرب اگر وسعت میں زیادہ ہیں تو اسلامیان پاکستان تعداد میں مسلمانان عرب کی مجموعی تعداد سے بھی کئی گنا زیادہ ہیں اور اسرائیل بھارت کے مقابلے میں چاہے بہت چھوٹا ہے لیکن مغربی استعمار کی پشت پناہی کی بنا پر بھارت سے کسی طرح بھی کمزور نہیں!

پہلے دور میں دنیا کی بڑی طاقتیں دو دھڑوں میں منقسم تھیں۔ ایک طرف روس اور چین پر مشتمل کمیونسٹ بلاک تھا اور دوسری طرف اینگلو امریکی اتحاد، اور ان کے مابین شدید کشمکش اور مسلسل جنگ جاری تھی جو کبھی گرم ہو جاتی تھی کبھی سرد۔ بھارت نے ایک نئی طاقت کی حیثیت سے ان کے مابین "ثالث" کا کردار اختیار کرنے کی کوشش کی اور اپنی نام نہاد آزاد اور غیر جانب دار خارجہ پالیسی کے نام پر خصوصاً مغربی بلاک کو پریشان کرنا شروع کیا۔ اس صورت حال کا عروج تھا وہ وقت جب ہندوستان میں "ہندی چینی بھائی بھائی" کے نعرے لگ رہے تھے! اس وقت مغربی بلاک کو شدید ضرورت تھی کہ اس علاقے میں کوئی ملک ایسا ہو جہاں اس کے قدم بھی کسی قدر جم سکیں۔ ان کی اس ضرورت کو اپنی خارجہ حکمت عملی میں فٹ کر کے پاکستان نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ یہ وہ دور تھا جب ہم پر چچا سام نہایت مہربان تھے اور ہمارے ہر طرح کے ناز نخرے برداشت کرنے کو تیار تھے ——— !! اور دوسری طرف ہم بھی ان کے کامل نیاز مند تھے اور ان کے اشارے پر کبھی سیٹو میں حاضری دیتے تھے کبھی سنٹو میں ——— !!

اس کے بعد حالات بدلے۔ ایک طرف چین اور روس کے مابین اختلافات کی خلیج نمودار ہوئی، دوسری طرف روس کا رویّہ مغربی اتحاد کے ساتھ بدلنا شروع ہوا، تیسری طرف بھارت کو "عقل" آئی اور اس نے اندر ہی اندر چچا سام سے تعلقات استوار کر لئے ——— اور چوتھی طرف روس، مغربی اتحاد اور بھارت تینوں نے چین کو اپنے مشترک دشمن کی حیثیت دینا شروع کر دی ——— نتیجۃً بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ حکمت عملی کے میدان میں ہم نے جس زمین پر تعمیر کی تھی وہ پیروں تلے سے کھسکنی شروع ہو گئی ——— اور بھارت کو امریکہ اور روس دونوں کے منظور نظر کی حیثیت حاصل ہو گئی ——— یہ ہمارے لئے مشکلات کے دور کا آغاز تھا۔ اس دور کے بالکل ابتدا میں ایک کوشش امریکہ نے یہ بھی کی کہ کسی طرح بھارت اور پاکستان کے مابین ایسی مکمل "مفاہمت" کرا دی جائے کہ یہ دونوں سوکنوں کی بجائے بہنوں کی صورت اختیار کر لیں اور دونوں ہمارے اشاروں پر یکساں حرکت کر سکیں۔ اسی غرض سے اس نے پنجاب کے دریاؤں کے پانی کے مسئلے کو جیسے تیسے حل کرانے کا کھکھیڑ مول لیا اور بعض دوسرے معاملات میں بھی صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کوششوں کا عروج (CLIMAX) تھی وہ تجویز جو امریکہ نے سابق صدر ایوب کے ذریعے پیش کرائی کہ پاکستان اور ہندوستان کا دفاع مشترک ہو جائے ——— اس تجویز پر پنڈت نہرو کے احمقانہ ردّ عمل سے اس معاملے میں (ANTI-CLIMAX) کے دور کا آغاز ہوا۔ اور

پاکستان میں آزاد خارجہ حکمت عملی کا دور شروع ہو گیا۔

اب ظاہر ہے کہ کسی کے کٹھ پتلی بنے رہنے میں جو آسانی اور عافیت ہے وہ اپنی آزاد رائے اور آزادانہ حیثیت و تشخص کو برقرار رکھنے اور دوسروں سے منوانے (یعنی ASSERT کرنے) میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ آزادی بہرحال جدوجہد اور محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کا مطالبہ کرتی ہے —— چنانچہ اس دور میں ہمیں لامحالہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔

اور اب جس تیسرے دور کا آغاز ہو رہا ہے وہ اسی صورت حال کی گویا ایک منطقی انتہا کا دور ہے۔ اس وقت جن حالات سے ہم دوچار ہیں وہ یہ ہیں: کہ ایک طرف صاحب برطانیہ بہادر تو بالکل ہی اپنی بساط مشرق سے لپیٹ گئے ہیں۔ خود چچا سام بھی پہلے کوریا اور پھر ویٹ نام میں اس قدر مار کھا چکے ہیں کہ اب اس علاقے سے کسی قدر باعزت طور پر کھسک جانے ہی میں عافیت محسوس کر رہے ہیں۔ دوسری طرف روس نے امریکہ کی خاموشی رضا کے تحت اس علاقے میں کچھ زیادہ ہی پاؤں پسارنے شروع کر دیئے ہیں اور تیسرے جنوب مشرقی ایشیا میں ان دونوں کا اصل اتحادی بھارت اور اصل دشمن چین بن چکا ہے —— اور اب امریکہ، روس اور بھارت تینوں مل کر زور لگا رہے ہیں کہ ہم ان کے تابع مہمل بن کر ان کی مرضی کے مطابق چین کی مخالفت میں ان کا پسندیدہ کردار ادا کریں اور اس علاقے میں بھارت کے مقابلے میں گھٹیا درجے کی شہریت (SECOND RATE CITIZEN SHIP) قبول کر لیں ——

اس طرح یہ دور ہماری قومی غیرت اور حمیت کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج بن کر شروع ہو رہا ہے اور اس کے لئے ہم پر ہر ممکن دباؤ کو استعمال کرنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف بھارت نے ایران اور عرب ممالک میں اپنے تجارتی و صنعتی اثر و رسوخ کے جال کو تیزی کے ساتھ بچھانا شروع کر دیا ہے اور یہ امر ہمیں ہوشیار کرنے کے لئے کافی ہونا چاہیئے کہ ان ممالک کی جانب سے بھارت کے ان عزائم کو خوش آمدید کہا جا رہا ہے۔ دوسری طرف بھارت نے افغانستان سے اپنے پرانے معاشقے کی از سر نو تازہ جوش و خروش کے ساتھ تجدید کرنی شروع کر دی ہے اور ایک فرخہ بند سے جو خطرہ مشرقی پاکستان کی زرعی معیشت کو تھا، اس کا حل بھی ابھی نہیں ہوا تھا کہ افغانستان سے آنے والے دریاؤں کو خشک کر کے مغربی پاکستان کی معیشت پر خطرناک وار کرنے کی سکیم پر سوچ بچار شروع ہو گیا ہے۔ تیسری طرف خاص اس موقع پر سرحدی گاندھی سے اندرا گاندھی کی ملاقات، انہیں نہرو پرائز وصول کرنے کے لئے بھارت آنے کی دعوت اور ان کی خدمت میں اسی لاکھ روپے کی رقم بطور نذرانہ پیش کرنے کی سکیم سے بھارت کے عزائم واضح طور پر سامنے آ رہے ہیں —— اور بھارت کی ان ساری کوششوں اور تدبیروں پر مستزاد ہیں روس کی تجاویز جو کبھی کوسیجن صاحب

سے پیش کردہ معاشی تعاون کے منصوبے کی صورت میں سامنے آتی ہیں اور کبھی برزنیف صاحب کی پیش کردہ "اجتماعی سلامتی" کی سکیم کی شکل اختیار کرتی ہیں —— اور ان سب پر ثبت ہے چچا سام کی منظوری و رضامندی کی مہر جو ایسی تمام تجاویز پر خاموشی یا "محتاط رد عمل" کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

یہ صورت حال ہر غیور اور باحمیت پاکستانی سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ کمر ہمت کس کر حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مستعد ہو جائے۔ اس مشکل کے وقت میں ہماری اصل قوت مدافعت و مزاحمت ایک آزاد اور باعزت و باوقار ملک و ملت کی حیثیت سے زندہ رہنے کے ایک شدید داعیے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور یہ داعیہ محض "زندگی برائے زندگی" کے نظریے سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس نظریے کے تحت تو انسان بسا اوقات ذلت اور بے عزتی کی حالت کو بھی گوارا کر لیتا ہے۔ یہ داعیہ کسی مقصد زندگی سے آشنا ہو کر ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ ملت اسلامیہ پاکستان کے اندر اگر کسی مقصد کا عشق پیدا ہو جائے اور یہ انسانیت کے لئے کسی نظریے اور پیغام کی علمبردار بن کر اٹھ کھڑی ہو تبھی اس میں وہ ہمت، وہ جرأت، وہ ایثار، وہ قربانی اور محنت و مشقت کا وہ جذبہ بیدار ہو سکتا ہے جو ان حالات میں اس کی بقا و تحفظ ہی نہیں ترقی و استحکام اور عزت و وجاہت کا ضامن بھی بن سکتا ہے —— اب ظاہر ہے کہ یہ نظریہ وہی ہو سکتا ہے جس کے نام پر پاکستان قائم ہوا تھا اور وہ پیغام اسلام کے پیغام کے سوا اور کوئی نہیں —— گویا جس طرح پہلی پیچیدگی کا اصل اور مستقل حل دینی جذبات اور ملی احساسات کو اجاگر کرنے میں ہے۔ اسی طرح اس دوسری پیچیدگی اور اشکال کا اصل حل اور اس سے پیدا شدہ چیلنج کا اصل جواب بھی یہی ہے کہ ہم بحیثیت قوم ایمان کے داعی اور اسلام کے علمبردار بن کر کھڑے ہوں اور اس مقصد کے ساتھ ایک ایسا والہانہ عشق ہمارے اندر پیدا ہو جائے کہ اس کے لئے بڑی سے بڑی محنت اور کٹھن سے کٹھن مشقت ہمیں آسان معلوم ہونے لگے اور بڑے سے بڑا ایثار اور اونچی سے اونچی قربانی حقیر محسوس ہو —— !!

اسی پیچیدہ صورت حال کا ایک ضمنی تقاضا بھی ہے اور وہ یہ کہ ہماری خارجہ حکمت عملی کو اب دور ثانی کے مقابلے میں بھی زیادہ "آزاد" ہونا چاہیئے اور اندریں حالات ہمیں عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ اپنے تعلقات پر پہلے سے بھی زیادہ زور دینا چاہیئے۔ چنانچہ خدا کا شکر ہے کہ اس موقع پر ایک طرف "دائیں بازو" کی چوٹی کی قیادت (TOP BRASS) نے بھی اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں چین کی مخالفت میں بڑی طاقتوں (SUPER POWERS) کا آلۂ کار ہرگز نہیں بننا چاہیئے اور دوسری طرف وزیر اعظم روس کے دہلی سے واپسی پر "سر راہے" ورود پاکستان اور اب صدر امریکہ کی خلائی جہاز کی واپسی کے منظر کو

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

افادات امام الہند شاہ ولی اللہ الدہلوی

محمد سرور عالم بی اے جائنٹ سیکرٹری ولی اللہ سوسائٹی پاکستان، لاہور

ارتفاقات
یعنی
انسان کی ثقافتی زندگی کے مدارج

امام ولی اللہ دہلوی رحؒ نے ارتفاقات یعنی انسان کی ثقافتی زندگی کے مدارج و مراتب پر خاص طور پر بحثیں کی ہیں۔ "ارتفاقات" امام صاحب کے فلسفے کی خاص اصطلاح ہے۔ اس کا واحد "ارتفاق" ہے، جس کا مادہ رفق ہے اور جس کے معنی نرمی یا نرمی سے کام لینے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو زندگی گزارنے کے سلسلے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، ان کو آسان کرنے کے لئے جو تدبیر وہ سوچتا ہے۔ ان کو "ارتفاقات" کہتے ہیں۔ امام صاحب ارتفاقات کی دو قسمیں کرتے ہیں:

(۱) ارتفاقات معاشیہ: انسان کو کھانے پینے، رہنے سہنے کے سلسلے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، ان کے حل کے طریقوں کا نام ارتفاقات معاشیہ ہے۔

(۲) ارتفاقات الٰہیہ: انسان کو جو فکری مشکلات پیش آتی ہیں اور اعلیٰ دماغی صلاحیتیں رکھنے والے لوگ جن مسائل پر سوچ بچار کرتے ہیں اور نہایت قیمتی نتائج پیدا کرتے ہیں۔ ان مسائل کا تعلق انسان کی حقیقت، نظام صالح کا قیام، کائنات کی تدبیر، صفات الٰہی کے دقائق اور اُخروی زندگی کے واقعات سے ہوتا ہے۔ یہ سب ارتفاقات الٰہیہ کہلاتے ہیں۔

امام صاحب ارتفاقات معاشیہ کے چار درجے بیان کرتے ہیں:۔

(۱) ارتفاق اول یعنی انسان کی دیہاتی زندگی۔ اس میں تمام ضروریات زندگی کا انتظام کر لیا جاتا ہے۔

(۲) ارتفاق دوم یعنی انسان کی شہری زندگی۔ اس میں میونسپلٹی کا انتظام آجاتا ہے۔

(۳) ارتفاق سوم یعنی انسان کی قومی زندگی۔ اس میں قومی ریاست قائم ہو جاتی ہے۔

(۴) ارتفاق چہارم یعنی انسان کی بین الاقوامی زندگی۔ اس میں تمام بین الاقوامی مسائل حل کئے جاتے ہیں۔

انسان نے اپنی "انسانی خصوصیات" کی بنا پر اپنی اجتماعی اور ثقافتی زندگی کی بنیاد رکھی ہے اور اسے ترقی دی ہے۔ اب جتنی کوئی قوم اجتماعیت میں ترقی کرے گی، اتنی ہی وہ مہذب اور ترقی یافتہ ہوگی۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی غرض یہ رہی ہے کہ وہ انسانوں کو ایسے طریقوں کی تعلیم دیں جن سے انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق بہتر بنا سکیں لیکن چونکہ انسان کی معاشرتی اور معاشی زندگی کا اس کے اجتماعی اخلاق پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اور معاشرے کا نظام خراب ہو جانے کی وجہ سے عوام بداخلاقیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کو لازماً اجتماع انسانی کی معاشرت اور معاشیات کی اصلاح بھی کرنی پڑتی ہے۔ تاکہ غلط خیالات، غلط رسوم اور غلط عادات کی اصلاح ہو کر صحیح عادات پیدا ہو سکیں اور ایسے ہی اُن کی اُخروی زندگی کی بھی اصلاح ہو جائے۔ چنانچہ امام ولی اللہ دہلوی رحؒ فرماتے ہیں:

> "اگرچہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی اصل غرض و غایت یہی ہوتی ہے کہ لوگوں کو اولاً و بالذات اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلقات عبودیت قائم کرنے کے طریقے سکھائیں لیکن اس کے ساتھ رسوم فاسدہ کی بربادی اور ارتفاقات کے قیام کی ترغیب بھی وہ اپنے مشن کا جزو بنا لیتے ہیں۔"

(حجۃ اللہ البالغہ جلد اول بحث ۲، باب ۱۱ ص ۱۰۴ طبع مصر)

یہ برگزیدگان الٰہی اس لئے نہیں آتے کہ انسان کی اجتماعی زندگی کو توڑ پھوڑ کر محض رہبانیت قائم کریں۔ چنانچہ حضرت امامؒ آگے فرماتے ہیں کہ:

> "اللہ تعالیٰ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ انسان اپنی تمدنی زندگی کے دوسرے درجے (ارتفاق دوم) یعنی شہری زندگی کو ترک کردیں یا تیسرے درجے (ارتفاق سوم) یعنی قومی زندگی سے بے توجہی برتیں۔ اور نہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی نے کبھی اس کا حکم دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء نے یہ بھی حکم نہیں دئے جیسے کہ ان لوگوں نے گمان کیا ہے جو پہاڑوں کی غاروں، جنگلوں اور بیابانوں میں جا بسے، اجتماعی زندگی ترک کر دی اور انسانی

اجتماع کی بھلائی برائی سے بالکل الگ ہو کر زندگی بسر کرنے لگے، اور وحشی جانوروں کی طرح ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کی تردید فرمائی ہے جنہوں نے ترکِ دنیا کا ارادہ کیا اور فرمایا "میں رہبانیت لے کر مبعوث نہیں ہوا بلکہ ایک آسان دینِ حنیفی لے کر مبعوث ہوا ہوں۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام نے تمدنی زندگی میں اعتدال پیدا کرنے کی تلقین کی ہے تاکہ نہ تو عوام ارتفاقات میں باریک بینیوں اور تکلفات میں مبتلا ہو کر اسے عیاشی کی حد تک پہنچا دیں جیسے کہ شاہانِ عجم تھے اور نہ اُسے بیابانی علاقوں میں رہنے والوں کے حال تک گرا دیں جو وحشیوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔" (البدور البازغہ [illegible])

تو نبی آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"لما كان الشر الساري في زمن ابراهيم عليه السلام هو نسيان التوحيد نزل الحق بإزائه بإشاعة التوحيد وتوقيت العبادات من طهارة وصلوٰة وزكوٰة وحج وصوم وذكر، ولما كان الشر الساري في زمن نبينا محمد صلى الله عليه وسلم اختلال العلل وانقلاب الارتفاقات خاصة على اصحابها وكان الامر اشتد واقتضى نزل الحق بإزائه بالجهاد واشاعة العبادات وتنقيتها واقتضى بزوال دولة الروم والعجم وانتظام امر الخليفة الارتفاق الروابح ففتح صلى الله عليه وسلم بابًا من الخير، بفتح قبابه وانتظمت به امة من الناس هي خير امة اخرجت للناس۔"	چونکہ سیدنا ابراہیم کے زمانے میں نسیانِ توحید کا شر معاشرۂ انسانی میں پھیل چکا تھا، اس لئے اس شر سے دنیا کو پاک کرنے کے لئے حق اس شکل میں نازل ہوا کہ توحید کی اشاعت کی جائے اور طہارت، نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ اور ذکرِ الٰہی کی عبادات پیدا کی جائیں۔ لیکن چونکہ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شر اس صورت میں جاری ہو چکا تھا کہ اقوامِ عالم کی تمدنی زندگی میں خلل پڑ چکا تھا اور ان کے ارتفاقات (معاشی اور معاشرتی زندگی) میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا اور یہ حالت نہایت شدید صورت اختیار کر گئی تھی اور اس کی خرابی بہت دور تک پہنچ چکی تھی، اس لئے اب حق ان ضرورتوں کے لئے اس صورت میں نازل ہوا کہ ان خرابیوں کے خلاف جہاد کیا جائے اور عبادات کی اشاعت کی جائے اور ان کے ادا کرنے کے اوقات معین کر دیئے جائیں اور حکمتِ الٰہی نے فیصلہ کیا کہ رومی اور ایرانی سلطنتیں برباد کر کے ان کی جگہ نظامِ نبوی کو ارتفاقِ چہارم یعنی بین الاقوامی پیمانے پر قائم کیا جائے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے نوعِ انسان کے لیے بھلائی کا وہ دروازہ کھل گیا جو اب تک نہ کھلا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے انسانوں کی ایک ایسی جماعت منظم ہو گئی جو نوعِ انسان کے لیے بہترین (نمونے کی) جماعت بن گئی۔

(تفہیمات الالٰہیہ جلد اول صفحہ [illegible])

ارتفاقات یعنی انسان کی تمدنی زندگی کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اور اس نے اپنی زندگی کی مشکلات آسان کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کیں؟ اس پر بحث کرتے ہوئے امام ولی اللہ دہلوی اپنی بے نظیر تصنیف حجۃ اللہ البالغہ جلد اول بحث ارتفاقات باب اول "کیفیت استنباط الارتفاقات" میں لکھتے ہیں:

"واضح رہے کہ انسان کھانے پینے، جذبۂ جنسی کی تسکین، دھوپ اور بارش سے بچنے اور سردی میں حرارت طلب کرنے وغیرہ حاجات میں اپنے ابنائے جنس یعنی حیوانات سے ملتا جلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی انسان پر یہ عنایت ہوئی کہ اس نے انسان کے فطری تقاضوں کے مطابق اسے الہام کیا کہ وہ کیسے ان حاجتوں کو پورا کرنے کے طریقے دریافت کرے۔ اس معاملے میں تمام انسانی افراد برابر ہیں سوائے ان کے جو ناقص الفطرت پیدا ہوں۔

یہ الہام ایسے ہی ہے جیسے شہد کی مکھی کو الہام کیا جاتا ہے کہ وہ کیسے پھولوں سے رس چوسے، پھر کیسے چھتہ بنائے جس کے اندر اس نوع کے دوسرے افراد مل جل کر رہیں، پھر وہ کیسے اپنے سردار کی اطاعت کریں، پھر وہ کیسے شہد بنائیں۔

اور جیسے پرندے کو الہام کیا جاتا ہے کہ وہ کیسے غذا کے دانے تلاش کرے اور کیسے پانی پینے کے لئے جائے اور کیسے بلی اور شکاری جانوروں سے بچنے کے لیے بھاگے اور کیسے اپنی ضروریات حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والوں سے لڑے اور کیسے جذبۂ جنس کی خواہش سے

وقت نر اپنی مادہ سے ملے، پھر کیسے وہ دونوں کسی پہاڑ میں گھونسلا بنائیں، پھر کیسے وہ انڈوں سے بچے نکالنے میں ایک دوسرے سے تعاون کریں، پھر کیسے اپنے بچوں کو چوگا دیں۔

ایسے ہی ہر نوع حیوانی کے لیے ایک قانون ہے جسے ان کے ذہنی تقاضے کے مطابق ان کے افراد کے سینوں میں ڈالا جاتا ہے۔

ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کو بھی الہام کیا کہ وہ کیسے اپنی ضروریات پورا کرنے کے لئے طریقے اختیار کرے؟

یہاں تک انسان حیوانات سے ملتا جلتا ہے اور اسے بھی فطری طریقے سے الہام ہوتا ہے جیسے حیوانوں کو الہام ہوتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے تین خصوصیات سے نوازا گیا ہے۔ ان کی وجہ سے انسان حیوانوں سے ممتاز ہو گیا ہے اور اس نے انسانی تمدن کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ کام حیوان نہیں کر سکے۔ جو قومیں ان خصائص کو ترقی دیتی ہیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ کام لیتی ہیں، اُن کا تمدن نہایت اعلیٰ و ارفع ہو جاتا ہے اور وہ دوسری اقوام پر فوقیت حاصل کر لیتی ہیں اور ان کی رہنما بن جاتی ہیں اور عزت کے مقام پر فائز ہو جاتی ہیں۔ یہ خصوصیات تین ہیں:

۱۔ رائے قوی یا رشد تام؛
۲۔ ظرافت یا حب جمال؛
۳۔ مادۂ ایجاد و تقلید یعنی عقلی آلات اور قوائے اجتماعی کا استعمال۔ (جاری ہے)

بقیہ: تذکرہ و تبصرہ

دیکھنے کے بعد "نکسن" [illegible] نے پاکستان کو بھی نوازنے جانے کے پروگرام سے یہ احساس شدت کے ساتھ ابھرا ہے کہ عوامی جمہوریہ چین کے وزیر اعظم چو این لائی کو بھی جلد پاکستان آنا چاہیئے (جس کا سب سے بڑا مظہر آج ۵ر جولائی کے اخبارات میں شائع شدہ صدر مملکت محمد یحییٰ خاں کا یہ بیان ہے کہ چو این لائی عنقریب پاکستان کا دورہ کریں گے)

نہ صرف یہ، بلکہ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ مستقبل قریب میں پاکستان کو روس، امریکہ اور بھارت کے اتحاد ثلاثہ کے احمقانہ دباؤ کے تحت کچھ زیادہ ہی تیزی کے ساتھ چین کی جانب جھکنا ہوگا اور یہ حالات کا ایک ایسا بہاؤ ہوگا، جس کے رخ کو روکنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں رہے گا ——!! (جاری ہے)

تدبر قرآن
مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ انعام

(۷)

۱۶ —— الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ ۖ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ
الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ○ فَالِقُ
الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذَٰلِكَ
تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ○ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ
لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ
لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ○ ۹۵-۹۷

[illegible]

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ: حَبّ: اور نویٰ، دانے اور گٹھلی کو کہتے ہیں۔ پہلے چھوٹی چیزوں سے آیاتِ الٰہی کے بیان کا آغاز کیا ہے، پھر کائنات کی بڑی چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فرمایا کہ ایک چھوٹے سے دانے اور ایک چھوٹی سی گٹھلی پر بھی خدا کے سوا کسی اور کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ ان کو پھاڑ کر ان کے اندر سے انکھوے نکالے اور پھر ان کو پودے اور درخت بنا دے۔ یہ خدا ہی کی قدرت اور اس کی حکمت ہے کہ وہ ایک ایک بیج اور ایک ایک گٹھلی کے اندر صلاحیتیں ودیعت فرماتا ہے، پھر ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے زمین، آسمان، ابر، ہوا، گرمی، سردی، خزاں اور بہار سب کو امر فرماتا ہے کہ سب مل کر اس کی پرورش میں اپنا اپنا حصہ ادا کریں۔ گویا اس زمین میں نشو و نما پانے والا ایک ایک دانہ اپنے وجود سے اس بات کی شہادت

دے رہا ہے کہ اسی کے تصرف سے وہ وجود میں آیا ہے جس کے تصرف میں یہ پوری کائنات ہے۔ اگر اس کائنات کی خدائی مختلف خداؤں اور دیوتاؤں میں بٹی ہوئی ہوتی اور وہ سب اپنے اپنے دائروں اور علاقوں میں خود مختار ہوتے تو اس دنیا کا نظام چلنا تو الگ رہا دانے کا ایک دانہ بھی اپنی صلاحیتیں اجاگر نہیں کر سکتا تھا۔

خدا کے قانون سے کوئی باہر نہیں

یُخرج الحی من المیت و مخرج المیت من الحی، بعینہٖ یہی ٹکڑا، معمولی فرق کے ساتھ آل عمران کی آیت ۲۷ میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم بقدر ضرورت اس کی شرح کر چکے ہیں۔ یہ بے جان چیزوں سے زندگی کے اظہار اور پھر زندگی کے اوپر موت اور فنا کے طاری ہونے کی ایک جامع تعبیر ہے جس کا مشاہدہ ہم اس کائنات کے ہر گوشے میں برابر کر رہے ہیں۔ آم کی بے جان گٹھلی اور گیہوں کے بے جان دانہ سے ہرا بھرا درخت اور لہلہاتا ہوا پودا پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اسی سرسبز شاداب درخت، اور لہلہاتے ہوئے پودے پر زردی، خشکی اور مُردنی طاری ہونی شروع ہوتی ہے یہاں تک کہ ایک دن وہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہی مشاہدہ ہم انسانوں اور حیوانوں میں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ قوموں اور ملتوں کے اندر بھی موت اور زندگی اور عروج اور زوال کی یہی داستان برابر دہرائی جا رہی ہے۔ ایک قوم پردۂ عدم سے نکلتی ہے ساری دنیا پر چھا جاتی ہے اور پھر وہی قوم ایک دن آتا ہے کہ پردۂ عدم میں جا چھپتی ہے۔ موت اور زندگی کے اس قانون سے کسی کے لیے مفر نہیں۔ اگر خدا کے سوا کسی اور کا بھی اس کائنات میں مالکانہ و خود مختارانہ تصرف ہے تو کسی ایک ہی گوشہ میں وہ اس قانون کو باطل کیوں نہیں کر دیتا اور اگر خدا سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ یہ سب کچھ مجرد مادے یا کسی اندھی بہری طاقت کا بلوہ ہے تو اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ بروز قائم و دائم رہے، نہ اس میں کبھی انقطاع ہو، نہ اس کے رخ میں کوئی تبدیلی واقع ہو، نہ اس پر کوئی تغیر طاری ہو۔

زبان کا ایک نکتہ

یہاں زبان کا ایک نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ پہلے تو فرمایا یُخرج الحی من المیت، لیکن دوسرے ٹکڑے میں اسلوب بدل کر فرمایا۔ مخرج المیت من الحی۔ مردہ سے زندہ کو نکالنے کے لیے فعل استعمال فرمایا جو صرف تصویر حال کا فائدہ دیتا ہے لیکن زندہ سے مردہ کو برآمد کرنے کے لیے فاعل کا صیغہ استعمال فرمایا جس کے اندر عزم اور فیصلہ کا مفہوم بھی مضمر ہوتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ زندگی حاصل ہو جانے کے بعد کوئی زندہ بھی اپنی زندگی موت کے حوالے کرنے پر راضی نہیں ہوتا لیکن قدرت کا قانون ایسا اٹل ہے کہ وہ بہرحال اس کو موت میں تبدیل کر ہی کے رہتا ہے۔ یہ نہایت واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ خدا کے سوا اس کائنات میں کسی کا کوئی دخل نہیں۔ اگر ہے کسی کا تو وہ اپنی محبوب زندگی

موت کے پنجہ سے کیوں نہیں بچا لیتا؟ یہی مضمون سورۂ واقعہ میں یوں بیان ہوا ہے فلولا ان کنتم غیر مدینین ترجعونھا ان کنتم صادقین ۸۶-۸۷ (اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو تو اپنی حلق میں آئی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لوٹا لیتے، اگر تم سچے ہو)

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کو انڈے اور مرغی اور مرغی اور انڈے کی حکایت تک محدود رکھا ہے لیکن اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ تعبیر ہے قدرت کے ان قوانین کی جو اس نے بے جان چیزوں کے اندر زندگی کے اور جاندار چیزوں کے اندر موت کے ودیعت کیے ہیں، جن کو صرف قدرت ہی بروئے کار لاتی ہے اور جن کی گرفت سے کوئی آزاد نہیں ہے۔

ایک قدم صحیح دوسرا قدم غلط

ذٰلکم اللہ فانّٰی تؤفکون، آگے فرمایا ہے ذٰلکم اللہ ربکم (وہی اللہ تمہارا رب ہے) اگر اس جملے کی تفسیر اس دوسرے جملے کی روشنی ہی میں کی جائے تو ماننا پڑے گا کہ یہاں خبر محذوف ہے۔ اور اگر اسی کو پورا جملہ مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ جو بیان ہوا وہ سب اللہ ہی کا کرشمۂ قدرت ہے تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو۔ یہ واضح رہے کہ اہل عرب اللہ کو نہ صرف مانتے تھے بلکہ ہر چیز کا خالق بھی اسی کو مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ شرک میں بھی مبتلا تھے، اس وجہ سے فرمایا کہ فکر سلیم کے لئے سیدھی راہ تو یہ ہے کہ جب یہ سارا تصرف اللہ ہی کا ہے تو بندہ صرف اسی کی عبادت و اطاعت کرے لیکن تمہاری عقل کہاں اوندھی ہوئی جاتی ہے کہ ایک قدم صحیح اٹھا کر پھر دوسرے رخ پر مڑ جاتے ہو اور پائی ہوئی حقیقت کو گم کر دیتے ہو۔

ایک اشارہ دلیل معاد کی سمت میں

یہ آیت اگرچہ واضح طور پر تو بیان توحید ہی کے سیاق میں ہے لیکن اس میں ایک لطیف اشارہ معاد کی طرف بھی ہو گیا۔ اس لئے کہ جب ہم ہر قدم پر مردہ سے زندہ کو ظاہر ہوتے دیکھتے ہیں تو اس بات پر تعجب کی کیا وجہ ہے کہ مر جانے اور سڑ گل جانے کے بعد خدا ہمیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا۔ گٹھلی اور دانہ اگر زمین میں سڑ گل کر از سر نو زندہ ہو سکتے ہیں تو ہم آخر زمین میں دفن ہو جانے کے بعد اللہ کے حکم سے دوبارہ کیوں نہیں زندہ ہو سکتے؟

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ
ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۔ ۹۶

زمین کے بعد ایک نظر آسمان کی طرف

فالق الاصباح و جعل الیل سکنا، یعنی وہی خدا جس کی شانیں زمین کے اندر دفن ہونے والے دانہ اور گٹھلی کے اندر یوں نمایاں ہوتی ہیں ذرا نگاہ اٹھا کر اس کی شانیں آسمان میں بھی دیکھو۔ وہ جس طرح گٹھلی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے درخت پیدا کر دیتا ہے اسی طرح پردۂ شب کو چاک

کرکے اس کے اندر سے صبح نمودار کر دیتا ہے۔ پھر فرمایا کہ اس نے شب کو تمہارے لیے سکون بخشنے والی اور تمہاری کلفت کو دور کرنے والی بنایا، تم اس میں دن کی ماندگی دور کرتے ہو اور تمہارے قویٰ اور اعصاب اس میں از سر نو میدان عمل میں اترنے کے لیے تازہ دم ہوتے ہیں۔ اس سے یہ اشارہ خود بخود نکل آیا کہ وہ رات کے بعد صبح اس لیے پیدا کرتا ہے کہ تم اس میں اپنی طلب و جستجو کی سرگرمیوں میں مصروف ہو سکو اور اپنی معاش کے لیے جد و جہد کر سکو۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ یوں بیان فرمایا، وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ سورۂ نبا ۹ - ۱۱ (اور ہم نے تمہاری نیند کو تمہارے لئے دافع کلفت بنایا، شب کو تمہارے لئے پردہ پوش بنایا اور دن کو حصول معاش کی سرگرمیوں کے لئے بنایا۔) مطلب یہ ہے کہ صبح اور شام، دن اور رات کی اس نوعیت پر غور کرو۔ تمہاری عقل یہ بات باور کرتی ہے کہ صبح کا لانے والا کوئی اور ہے، شام کا لانے والا کوئی اور، دن کا پیدا کرنے والا کوئی اور ہے، رات کا پیدا کرنے والا کوئی اور؟ یا یہ بات قبول کرتی ہے کہ صبح اور شام، رات اور دن سب اللہ ہی کے حکم سے آتے جاتے ہیں؟ اگر دن کا خالق کوئی اور، رات کا خالق کوئی اور ہوتا تو ان دونوں میں یہ موافقت و سازگاری کون پیدا کرتا کہ رات تمہارے لئے راحت کا بستر بچھاتی اور میٹھی نیند کے لئے سکون فراہم کرتی ہے اور دن تمہارے لیے سرگرمیوں کے میدان گرم کرتا اور معاش و معیشت کی راہیں کھولتا ہے۔

'والشمس والقمر حسبانا' دن اور رات کے بعد اب یہ رات اور دن کے اندر ظاہر ہونے والی دو بڑی نشانیوں سورج اور چاند کو لیا۔ فرمایا کہ ان کو دیکھو، ان کے لئے قدرت کا ٹھہرایا ہوا ایک ضابطہ اور ایک نظام الاوقات ہے، مجال نہیں ہے کہ یہ سر مو اس سے تجاوز کر سکیں۔ انہی سے دن، مہینے، سال معین ہوتے ہیں، انہی سے موسموں کا تغیر وجود میں آتا ہے۔ پھر یہ ہیں تو آسمان میں لیکن پوری وفاداری اور پوری پابندی کے ساتھ بلاکسی تمنائے ستائش اور پروائے صلہ کے رات دن خدمت میں سرگرم ہیں زمین والوں کی۔

'ذلک تقدیر العزیز العلیم' اوپر کی بیان کردہ نشانیوں سے جو حقیقت سامنے آتی ہے، یہ اسی کا بیان ہے اور انداز بیان ایسا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر اس شخص کے دل کی آواز ہے جو اس نظام کائنات پر عقل سلیم اور قلب سلیم سے غور کرتا ہے۔ جس کی عقل سلیم ہے وہ جب اس نظام اور اس کی بے پایاں برکات پر غور کرتا ہے تو بے تحاشا اس کی زبان سے یہ نعرہ نکلتا ہے کہ یہ ساری منصوبہ بندی خدائے عزیز و علیم کی ہے۔

اس چھوٹے سے فقرے کے اندر کئی حقیقتیں مضمر ہیں۔

ایک یہ کہ یہ سورج اور چاند خدائی میں کوئی دخل نہیں رکھتے بلکہ اس کارخانۂ کائنات میں ان کی حیثیت صرف کل پرزوں کی ہے جن کو ایک عزیز و علیم نے ان کے مقام میں فٹ کیا ہے اور وہ اپنی مفوضہ خدمت پوری پابندی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

دوسری یہ کہ یہ کارخانہ متضاد قوتوں اور مختلف دیوتاؤں کی کوئی رزمگاہ نہیں ہے بلکہ اس کے اضداد کے اندر حیرت انگیز سازگاری ہے اور ان کی یہ باہمی سازگاری اس بات کی شاہد ہے کہ ایک ہی خدائے قاہر و قیوم اور ایک ہی رب عزیز و علیم کا ارادہ اور اس کی مشیت اس پر کارفرما ہے اور اس کی ہر حرکت اور اس کا ہر سکون اسی کی مشیت کے تابع ہے۔

تیسری یہ کہ یہ کارخانہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ نہیں ہے بلکہ اس کے ہر گوشے سے اس کے صانع کی قدرت، حکمت اور اس کے علم کی شہادت مل رہی ہے جو اس بات کا ثبوت فراہم کر رہی ہے کہ اس کے پیچھے ایک عظیم غایت و مقصد ہے جس کا ظہور میں آنا لابدی ہے۔ اسی وجہ سے ضروری ہے کہ اس کے بعد ایک روز جزا و سزا آئے جس میں اس کی حکمت واضح ہو۔

چوتھی یہ کہ یہ دنیا کسی کباڑیئے کی دکان یا کوئی مال گودام نہیں ہے جس میں کسی چیز کا بھی کوئی قرینہ نہ ہو بلکہ اس میں نہایت حیرت انگیز پلاننگ ہے، ہر چیز کے لیے اس کی متعین جگہ ہے، ہر حرکت اور گردش کے لیے متعین محور و مدار ہیں، ہر عمل کے ظہور کے لیے بندھے ضابطے قاعدے ہیں، ہر آزادی اور ہر پابندی کے لیے معلوم و معروف حدود و قیود ہیں۔ اس سے صاف یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس جہان کے خالق کی مرضی انسان کے لیے بھی یہی ہے کہ وہ شتر بے مہار کی زندگی نہ گزاریں بلکہ اس کی ہدایات اور اس کے احکام کے تحت زندگی بسر کریں تاکہ ان کی زندگی اس پورے کارخانہ سے ہم آہنگ ہو۔ یہی راہ فلاح و سعادت کی راہ ہے۔ سورۂ رحمان میں ہم آیت 'والشمس والقمر بحسبان' کے تحت اس نکتہ کی مزید وضاحت کریں گے۔ وہاں قرآن نے اسی آفاقی شہادت سے رسالت کی ضرورت پر استشہاد کیا ہے۔

اس آیت میں 'تقدیر' کا لفظ وہی مفہوم رکھتا ہے جو پلاننگ (Planning) کا مفہوم ہے۔ 'عزیز' کی صفت خدا کی بے نہایت قدرت اور سب پر اس کی بالاتری کو اور 'علیم' کی صفت اس کے محیط کل علم کے ساتھ ساتھ اس کی بے نہایت حکمت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس لئے کہ علم حکمت کو بھی مقتضی ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ خدا اس نظام کائنات کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ وہ سب سے بالاتر ہے۔ اس کی قدرت، اس کا علم اور اس کی حکمت سب کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۹۷

ستاروں کی خدمت گزاری

سورج اور چاند کے بعد ستاروں کی طرف متوجہ کیا کہ دیکھو، یہ بھی خود اپنی خدمت گزاری سے شہادت دیتے ہیں کہ خالق نے ان کو تمہاری خدمت پر مامور کیا ہے۔ جب تم خشکی اور تری کا سفر کرتے ہو تو سمندروں اور بیابانوں میں یہ روشنی کے میناروں اور برجیوں کی طرح تمہاری کشتیوں اور قافلوں کو سمتیں اور راستے بتاتے ہیں۔ اب یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے کہ وہ خود تو اپنے عمل سے بتا رہے ہیں کہ تمہار نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے لیکن تم ان کو خدا کی خدائی میں شریک مان کر ان کی پرستش شروع کر دو۔ پھر یہ دیکھو کہ یہ ہیں تو آسمان میں لیکن شمع برداری کی خدمت وہ تم زمین والوں کی انجام دے رہے ہیں۔ سوچو کہ زمین کا خدا الگ ہوتا اور آسمانوں کے دیوتا الگ ہوتے تو آسمان کے ستاروں کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین والوں کو راستہ بتانے کے لیے ساری رات دیدبانوں میں کھڑے کھڑے اپنی نیند بے خراب کرتے۔ یہ صورت حال تو صاف شہادت دیتی ہے کہ زمین و آسمان سب پر ایک ہی خدا کی حکمرانی ہے اور اسی نے ان ستاروں کو تمہاری خدمت کے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم اپنے رب کے شکرگزار بنو اور اسی کی عبادت کرو۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ عرب شعرا اپنے بیابانی سفروں کی جو داستان بیان کرتے ہیں اس میں ستاروں کا ذکر ان کی رہنمائی کے پہلو سے بھی کرتے ہیں اور رات کے مختلف حصوں کے اوقات بتانے کے لیے بھی انہی کا حوالہ دیتے ہیں۔ گویا وہ ان سے گھڑیوں کا کام بھی لیتے تھے اور رہنما برجیوں کا بھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بعض ستاروں کی پرستش بھی کرتے تھے۔ شعریٰ کا حوالہ تو قرآن میں بھی آیا ہے جو موسم بہار میں طلوع ہوتا تھا۔ اسی طرح دوسرے ستارے بھی، جو نکھتروں سے تعلق رکھتے تھے، ان کے معبود تھے۔ بعض سعد سمجھے جاتے تھے، بعض نحس۔

لفظ آیات کے مختلف معانی [illegible]

'قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ': لفظ 'آیت' کے مختلف معانی پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں یہ نشانی کے معنی میں ہے اور چونکہ ہر نشانی اس چیز کی دلیل ہوتی ہے جس کی وہ نشانی ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے معنی دلائل کے ہوں گے اور چونکہ یہاں زیر بحث خدا اور اس کی توحید اور ضمناً معاد و رسالت ہے اس وجہ سے یہاں مراد انہی کے دلائل ہوں گے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہر نشانی اپنے اندر گوناگوں پہلو رکھتی ہے اس وجہ سے یہ تو بتا دیا ہے کہ ہم نے نشانیوں کی تفصیل کر دی ہے لیکن یہ نہیں واضح فرمایا کہ کس چیز کی نشانیاں واضح فرمائی ہیں۔ یہ چیز مخاطب کے فہم پر چھوڑ دی ہے کہ اس

کے اندر علم کی طلب و جستجو ہو گی تو وہ ان میں اپنی ہر جستجو کا جواب پا جائے گا۔

یہاں لفظ 'آیات' کے استعمال میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے۔ منکرین قریش کے متعلق اوپر بھی بیان ہو چکا ہے اور اس مجموعۂ آیات کے خاتمہ پر بھی ذکر آئے گا کہ وہ قرآن پر ایمان لانے کے لیے یہ شرط لگاتے ہیں کہ پیغمبر کوئی نشانی دکھائیں تو وہ ایمان لائیں گے۔ نشانی سے مراد وہ کوئی محسوس معجزہ لیتے تھے۔ ان کی اسی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر فرمایا کہ اگر نشانیوں کی طلب ہے تو عقل و دل کو مطمئن کرنے والی نشانیاں یہ ہم نے بیان کر دی ہیں لیکن یہ کارآمد ان کے لیے ہیں جو علم کے طالب ہیں۔ جن کے اندر علم کی طلب نہیں ہے، وہ دنیا جہان کے معجزے دیکھ کر بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں۔

فعل ارادۂ فعل کے مفہوم میں

'لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ': ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں کہ فعل ارادۂ فعل کے لیے بھی آتا ہے اس وجہ سے لقوم یعلمون کا مطلب یہ ہو گا کہ ان کے لیے جو جاننا چاہیں۔ یہ بات یہاں واضح رہے کہ ہم اپنی زبان میں بھی جب بولتے ہیں 'ان کے لیے جو آئیں'، 'ان کے لیے جو سمجھیں'، 'ان کے لیے جو غور کریں'، تو فعل ارادۂ فعل ہی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ۹۸

[illegible]

خارجی عالم کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب یہ انسان کی خود اس کی خلقت اور اس کے اردگرد جو سامان معاش و معیشت فراہم فرمایا ہے اس کی طرف توجہ دلائی۔ فرمایا کہ وہی خدا ہے جس نے تمہیں ایک ہی جان سے پیدا کیا اور نسل انسانی کا ایک وسیع گھرانا آباد کر دیا۔ یہاں 'انشاء' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف پیدا کرنے کے نہیں ہیں بلکہ اس کے اندر نشو و نما بخشنے، پروان چڑھانے اور فروغ دینے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ 'ایک ہی جان' سے مراد آدم ہیں جن کو تمام آسمانی مذاہب میں نسل انسانی کی اصل کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ اہل عرب بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے۔ فرمایا کہ یہ خدا ہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا، پھر مردوں اور عورتوں کی ایک دنیا پیدا کر دی۔ ان میں شکلوں، صورتوں، زبانوں، لہجوں کا اگرچہ اختلاف ہے، لیکن جبلی تقاضوں اور فطری داعیات کے لحاظ سے اتفاق ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ سب کا خالق اور پروردگار ایک ہی ہے جس نے ایک ہی درخت سے یہ سارے برگ و بار پیدا کیے ہیں۔ عورت اور مرد میں بظاہر تضاد و اختلاف ہے لیکن ان دونوں کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ سازگاری کے جو ظاہری و باطنی محرکات و اسباب جمع ہیں وہ زبان حال سے شہادت دے رہے ہیں

کہ دونوں کا خالق و مربی ایک ہی ہے جس نے ایک مشترک مقصد کے لئے ان کو وجود بخشا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غور کرو کہ یہ ایک ہی خدا کا پیدا کیا ہوا اور ایک ہی آدم و حوا کا گھرانا ہے یا مختلف خداؤں کی پیدا کی ہوئی منتشر بھیڑ جس کے ہر گروہ کے خدا بھی الگ الگ ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا باوا آدم بھی جداگانہ ہے۔

قرآن نے اسی وحدت الٰہ اور وحدت آدمؑ کے عقیدے پر انسانی معاشرے کی بنیاد رکھی ہے اور ان لوگوں کو فساد فی الارض کا مجرم قرار دیا ہے جو اس عقیدہ کو ڈھانے کی کوشش کریں۔ اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ ہم سورۂ نساء کی تفسیر میں بحث کر آئے ہیں۔ اس کی پہلی آیت اس عقیدے کو یوں پیش کرتی ہے:۔

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ
الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ
وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا
زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا
وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ
تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ
اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا۔ (نساء ۱)

اے لوگو، تم اپنے اس خداوند سے ڈرو جس
نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا، اور اسی
کی جنس سے پیدا کیا اس کے جوڑے کو اور پھر
ان دونوں سے پھیلا دیئے بے شمار مرد اور بے شمار
عورتیں، اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے
سے تم ایک دوسرے سے طالب مدد ہوتے ہو
اور رحمی رشتوں کا احترام کرو۔ بے شک
اللہ تم پر نگراں ہے۔

مستقر اور مستودع

’فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ‘۔ ’مستقر‘ کے معنی قرار و سکونت کی جگہ کے ہیں اور ’مستودع‘ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز بطور ودیعت و امانت حفاظت سے رکھی جائے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں مستقر سے مراد وہ جگہ ہے جہاں پیدا ہونے کے بعد انسان رہتا بستا ہے۔ ’ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین‘ (۳۶۔ بقرہ) (اور تمہارے لئے زمین میں ایک وقت خاص تک رہنے بسنے کی جگہ اور کھانا پلانا ہے)۔ ’مستودع‘ سے مراد وہ جگہ ہے جہاں مرنے کے بعد وہ دفن کیا جاتا ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد انسان یہ دونوں ہی چیزیں پاتا ہے۔ جتنی زندگی اس کے لئے مقدر ہوتی ہے اتنے دن وہ گزارتا ہے اور جو رزق اس کے لیے مقدر ہوتا ہے اس سے متمتع ہوتا ہے اور یہ اس کا جینا اور خدا کے بخشے ہوئے رزق سے متمتع ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی نگرانی اور اس کے علم میں ہے۔ پھر جب اس دنیا میں اس کی مدت حیات ختم ہو جاتی ہے تو وہ اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کرتا ہے

اور جہاں کہیں بھی دفن ہوتا ہے خدا ہی کی زمین میں دفن ہوتا ہے اور جب خدا کا حکم ہوگا زمین اس امانت کو خدا کے حوالے کر دے گی جس طرح ہر شخص کا مستقر خدا کے علم میں ہوتا ہے، اسی طرح اس کا مستودع بھی اس کے علم میں ہوتا ہے۔ خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں۔ قرآن مجید میں یہ مضمون دوسرے مقامات میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ مثلاً: وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقها ویعلم مستقرها ومستودعها کل فی کتاب مبین ۶۔ ہود (اور نہیں ہے زمین میں کوئی جاندار مگر اللہ ہی اس کو روزی دیتا ہے، اور خدا دنیا میں اس کے مستقر کو بھی جانتا ہے اور مرنے پر اس کے سپرد کئے جانے کی جگہ کو بھی ہر چیز ایک واضح رجسٹر میں درج ہے) مطلب یہ ہے کہ پیدا ہونے کے بعد زندگی، رزق اور اسباب و وسائل سب کچھ اسی سے حاصل ہوتا ہے تو کسی غیر کو انسان اپنی امید کا مرجع کیوں بنائے؟ پھر مدفن کے لئے مستودع، کا لفظ استعمال کر کے ایک لطیف اشارہ مرنے کے بعد اٹھائے جانے کی طرف بھی فرما دیا کہ انسان جب مرتا ہے تو یہ نہیں ہے کہ وہ ختم ہو گیا بلکہ وہ زمین کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے جہاں سے وہ پھر اٹھایا جائے گا تاکہ وہ اپنی شکرگزاری کا انعام پائے اگر خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کا اس نے حق پہچانا ہے اور اپنی ناشکری کی سزا بھگتے اگر اس نے خدا کی نعمتوں کی ناقدری کی ہے۔ یہ خدا کی رحمت و ربوبیت اور اس کے علم و حکمت کا لازمی تقاضا ہے۔

’قد فصلنا الآیات لقوم یفقهون‘۔ اس میں وہی بات فرمائی گئی ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ اس کا اعادہ اس بات کی دلیل ہے کہ مخاطب نہایت ضدی ہیں جو بات کو سمجھنا نہیں چاہتے لیکن بہانہ یہ تراش رہے ہیں کہ ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا جا رہا ہے۔ علم اور تفقہ میں فرق یہ ہے کہ علم عقل و شعور کا فعل ہے اور تفقہ دل کا، چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ ارشاد ہوا ہے لهم قلوب لا یفقهون بها (ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں)۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ انسان پر خدا کی نشانیاں اس وقت ظاہر ہوتی ہیں جب وہ اپنی عقل اور اپنے دل کو استعمال کرتا ہے۔ جب تک وہ محسوسات کا غلام بنا رہتا ہے اس وقت تک اس کی مثال گونگے کی ہے جو گونگے کی زبان کے سوا دوسری کوئی زبان بھی نہیں سمجھتا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ عقل اور دل بھی مشاہدۂ کائنات سے خدا تک اسی صورت میں پہنچتے ہیں جب ان کے اندر محسوسات سے آگے بڑھنے کی ہمت اور حوصلہ ہو۔ اگر وہ صرف محسوسات ہی پر قانع ہو جائیں اور ان کی ساری تگ و دو انہی چیزوں کے لئے رہ جائے جو اس حیات چند روزہ میں کام آنے والی ہیں تو بسا اوقات تل تو ان کو نظر آ جاتا ہے لیکن تل کے اوٹ کا پہاڑ ان سے

اوجھل ہی رہتا ہے۔ یہ جب عاجلہ کی بیماری ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دیکھنے کو تو سب کچھ دیکھتے ہیں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۹۹

آفاق کی نشانیوں میں انفس کی نشانیاں

اب یہ خدا کی رحمت، ربوبیت، قدرت، حکمت، توحید اور معاد کے ان آثار و دلائل کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جو ہر انسان کو قدم قدم پر نظر آ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ماننا چاہے۔

'وھو الذی انزل من السماء ماء فاخرجنا بہ نبات کل شیء': لفظ 'سماء' پر ہم دوسری جگہ لکھ چکے ہیں کہ یہ بادلوں کے لیے بھی آتا ہے اور اس فضائے نیلگوں کے لیے بھی جس کو ہم آسمان کہتے ہیں۔ فرمایا کہ وہی خدا ہے جو آسمان سے بارش برساتا ہے اور اس سے ہر چیز کو روئیدگی بخشتا ہے۔ کلام کا آغاز غائب کے صیغہ سے فرمایا پھر اس کو 'فاخرجنا بہ' متکلم کے صیغہ میں بدل دیا۔ اس میں رأفت، عنایت اور ربوبیت کا اظہار بھی ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی کہ آسمان و زمین اور ابر و ہوا سب پر ہماری ہی حکومت ہے، اگر آسمان پر کسی اور کی حکومت ہوتی، زمین پر کسی اور کی تو یہ توافق کہاں سے ظہور میں آتا کہ آسمان سے پانی برستا اور زمین اپنے خزانے اگل دیتی۔ پھر اس میں ایک لطیف تلمیح آخرت کی بھی ہے۔ قرآن میں اسی بارش اور اس کے اثر سے مردہ زمین کے از سر نو جی اٹھنے کو متعدد مقامات میں معاد کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے کہ جب تم ہمیشہ دیکھتے ہو کہ زمین پر ایک تنکا بھی نہیں ہوتا ہے لیکن بارش ہوتی ہے تو اس کے اندر کی دبی ہر چیز جاگ پڑتی ہے اور گوشہ گوشہ سبزے سے معمور ہو جاتا ہے تو مر جانے کے بعد جی اٹھنے کو کیوں بعید سمجھتے ہو؟

ربوبیت عامہ کے بعد بعض اشارات

'فاخرجنا منہ خضرا نخرج منہ حبا متراکبا': یہ ربوبیت عامہ کے بعد ربوبیت خاصہ کا بیان ہے جس کا تعلق انسانوں سے ہے۔ پہلے غلہ کا ذکر فرمایا جو عام ضرورت کی چیز بھی ہے اور اپنی پائداری کے اعتبار سے ذخیرہ کیے جانے کے لائق بھی۔ فرمایا کہ انھی نباتات میں سے جن کے اندر ہم نے غلہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھی ہے، سرسبز خوشے اور بالیاں نکالتے ہیں اور اپنی قدرت و حکمت سے ان پر تہ بہ تہ دانے جما دیتے ہیں اور اس طرح تمہارے بوئے ہوئے ایک دانے پر سینکڑوں دانوں کا اضافہ کر کے ہم تمہیں لوٹا دیتے ہیں۔ غور کرو کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے، کسی اندھی بہری قوت

کا ظہور ہے، یا کسی علیم و قدیر اور دانا و بصیر پروردگار کی پروردگاری ہے! اتنے اجزائے مختلفہ کو اتنی تدبیر، اتنی تدریج اور اتنی حکمت سے استعمال کرنا اور ان کے حاصل کو تمہاری زندگی کے بقا کا ذریعہ بنا دینا ایک رب کریم و کارساز کے سوا اور کس کا کام ہو سکتا ہے!

'ومن النخل من طلعها قنوان دانیۃ وجنت من اعناب': ان دونوں ٹکڑوں میں فعل محذوف ہے۔ پہلے میں مجہول، دوسرے میں معروف۔ غلہ کے بعد اب یہ پھلوں کا ذکر فرمایا اور پہلے کھجور کو لیا جس کو اہل عرب کے ہاں عام پھل کی حیثیت حاصل تھی۔ کھجور کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ اس کے درخت، اس درخت کے اندر گابھے کا پیدا ہونا اور پھر اس سے لٹکتے ہوئے بوجھل خوشوں کا ظہور میں آنا، ہر چیز کی طرف توجہ دلا دی ہے تاکہ اس کاریگری پر انسان کی نظر پڑے جو اس کے ابتدائے ظہور سے لے کر اس کی تکمیل اور پختگی تک قدرت اس پر صرف کرتی ہے۔ اسی کاریگری اور صنعت پر غور کرنے سے انسان کو صانع کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس کی قدرت و حکمت اور اس کی رحمت و ربوبیت کا کچھ اندازہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت کا منشا ان قدرتوں اور حکمتوں کے اظہار سے یہی ہے کہ انسان کو اس کی معرفت حاصل ہو ورنہ جہاں تک کھجور کی ضرورت بحیثیت غذا کے لیے ہے اس کی فراہمی کے لیے وہ اس بات کی محتاج نہ تھی کہ ایک چھوٹی سی گٹھلی سے درجہ بدرجہ ایک تناور درخت بنے، پھر ایک خاص مرحلہ میں پہنچ کر اس کے اندر گابھے اور خوشے پیدا ہوں، پھر ان کے اندر ننھی ننھی کیریاں بیٹھیں، پھر وہ درجہ بدرجہ پھل بنیں، پھر پک کر اور بوجھل ہو کر ان کے خوشے زمین کی طرف لٹک آئیں اور انسان کو زبان حال سے دعوت شوق دیں۔ یہ سارا اہتمام دل گواہی دیتا ہے کہ اسی لیے ہے کہ انسان پر خدا کی قدرت، اس کی ربوبیت اور اس کی حکمت کے اسرار ظاہر ہوں لیکن یہ سائنس کا عجیب اندھا پن ہے کہ اس کو حکمت تو نظر آتی ہے لیکن حکیم نظر نہیں آتا، ربوبیت تو اس کو دکھائی دیتی ہے لیکن رب کا سراغ اس کو کہیں نہیں ملتا۔ اور اس سے زیادہ عجیب معاملہ ان لوگوں کا ہے جو دیکھتے ہیں کہ کھجور کے درخت کے پیدا ہونے سے لے کر اس کے پھل پھولنے، پھلنے اور پکنے تک تمام عناصر کائنات نے اس کی دیکھ بھال اور غور و پرداخت میں اپنا اپنا حصہ ادا کیا تب کہیں کھجور کا ایک خوشہ تیار ہوا ہے لیکن پھر بھی وہ اس سفاہت میں مبتلا ہیں کہ یہ کائنات مختلف ارادوں اور بے شمار دیوتاؤں کی ایک رزمگاہ ہے۔ اور ان سے بھی زیادہ عجیب معاملہ ان سادہ لوحوں کا ہے جو ربوبیت اور پروردگاری کے یہ سارے سر و سامان دیکھ رہے ہیں اور ان سے متمتع اور محظوظ بھی ہو رہے ہیں لیکن سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کے کھانے پینے، عیش کرنے کے لیے ہے۔ یہ سوال ان کے ذہن میں کبھی نہیں پیدا ہوتا کہ یہ سب کچھ مہیا کرنے والے کی طرف سے ان پر کوئی ذمہ داری بھی عائد

ہوتی ہے یا نہیں؟ ان نعمتوں کے باب میں کوئی پرسش کا دن بھی آنے والا ہے یا نہیں؟ گویا دینے والے نے حق تو ان کو سارے بخش دیئے لیکن ذمہ داری ان کے اوپر کوئی بھی نہیں ڈالی۔

[illegible] کی حکمت

'والزیتون والرمان مشتبھا وغیر متشابہ'، کھجور کے بعد انگور، زیتون اور انار کا ذکر فرمایا۔ مقصود ان کے ذکر سے صرف انہی متعین پھلوں کا ذکر نہیں ہے، ان کا ذکر صرف اس پہلو سے ہوا کہ یہ اہل عرب کے معروف پھل تھے جو ان کو خود اپنے علاقے میں میسر تھے، اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ خدا نے تمہاری ربوبیت کا جو سامان کیا تو اس میں صرف روٹی ہی نہیں بلکہ مختلف قسم کے فواکہ اور میوہ جات بھی ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ فواکہ بھی جو دیئے تو اس میں بھی اپنی ربوبیت، اپنی رحمت، اپنی فیاضی اور اپنی قدرت و حکمت کی یہ شان دکھائی کہ ایک ایک چیز کی گوناگوں اقسام و انواع، ایک دوسری سے ملتی جلتی بھی اور باہمدگر شکل، رنگ، قامت، ذائقہ میں مختلف بھی، تمہارے سامنے چن دیں۔ اب سوچو کہ جس نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ رحیم، قدیر، علیم، حکیم اور کریم پروردگار ہے یا نہیں۔ آخر تمہاری زندگی بجز اپنے بقا کے لئے تو ان پھلوں اور ان تمام تنوعات کی محتاج نہ تھی، تم جیسے تو خشک روٹی اور پانی سے بھی جی سکتے تھے، پھر اس نے ایسا کیوں کیا کہ تمہارے آگے اتنے گوناگوں پھلوں کے انبار لگا دیئے جن کی خوشبو، ذائقہ، شکل ہر چیز دل لبھانے والی، آنکھوں کو فریفتہ کرنے والی اور دماغ کو مست کرنے والی ہے۔ یہ اسی لئے ہے کہ ان میں سے ہر چیز کے اندر انسان اپنے خالق کی صفات کا جلوہ دیکھے اور پھر انہی صفات کے آئینہ میں اپنے ظاہر اور اپنے باطن کو سنوارے اور ان میں سے ہر نعمت اس کے اندر اس جذبۂ شکر و سپاس کو ابھارے جو خدا نے ہر انسان کے اندر ودیعت فرمایا ہے اور جو تمام دین و شریعت کی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، بنیاد ہے۔

[illegible]

'انظروا الی ثمرہ اذا اثمر وینعہ'۔ 'الی ثمرہ' میں ضمیر کا مرجع یوں تو وہ ساری ہی چیزیں ہیں جن کا اوپر ذکر گزرا لیکن ضمیر واحد اس وجہ سے ہے کہ متکلم چاہتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو الگ الگ لے کر ان کے پیدا ہونے سے لے کر ان کے پکنے کے تمام مراحل پر غور کیا جائے۔ غور و فکر کا عمل فطری طور پر یہ تقاضا کرتا ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی چیز پر نگاہ جمائی جائے تاکہ قوت فکر منتشر نہ ہو۔ گویا یہاں قرآن نے صرف غور و فکر کی دعوت ہی نہیں دی بلکہ اس کا صحیح طریقہ بھی بتا دیا۔ یہ واضح رہے کہ اس اسلوب کی مثالیں قرآن میں بھی ہیں اور کلام عرب میں بھی۔

'وینعہ' کے بعد 'اذا اینع' ہمارے نزدیک حذف ہے۔ ہم دوسرے مقام میں عربی زبان کا یہ اسلوب واضح کر چکے ہیں کہ بعض اوقات ایسے مقابل الفاظ حذف کر دیئے جاتے ہیں جن کی مذکور

الفاظ کے بعد کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہاں چونکہ 'الی ثمرہ' کے بعد 'اذا اثمر' موجود تھا اس وجہ سے 'وینعہ' کے بعد 'اذا اینع' کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مذکور محذوف پر خود دلیل بن گیا۔

[illegible]

فرمایا کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو لے کر اس کے پھٹنے سے لے کر اس کے پکنے کے مراحل تک ہر مرحلے کو دیکھو اور اس پر غور کرو تو خالق کی قدرت، حکمت، ربوبیت، صناعی، کاریگری، باریک بینی، فیض بخشی اور اس کے حسن و جمال کی اتنی نشانیاں اور اتنی شہادتیں تمہارے سامنے آئیں گی کہ تم ان کو شمار نہیں کر سکو گے۔ تم ایک نشانی اور ایک معجزہ مانگتے ہو، آنکھیں ہوں تو ہر شاخ معجزہ، ہر پھول معجزہ، ہر پھل معجزہ۔ کوئی چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے اندر قدرت کے اعجاز کے ہزاروں شاہکار جلوہ نما نہ ہوں۔ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ دنیا اپنے بقا کے لیے ان تمام عجائب کی نمائش کی محتاج نہ تھی۔ یہ بالکل سادہ اور بے ڈھنگ حالت میں بھی وجود میں آ سکتی اور باقی رہ سکتی تھی لیکن خالق کائنات نے یہ پسند فرمایا کہ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتی سے اس کی عظیم قدرت و حکمت اور اس کی بے نہایت رحمت و ربوبیت ظاہر ہو تاکہ انسان اس کی معرفت حاصل کرے لیکن یہ انسان کی عجیب بدقسمتی ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنی ذہانت کے مظاہرے کا اتنا مشتاق ہے کہ اگر ہڑپہ اور موہنجو داڑو کے مدفون کھنڈروں سے کوئی ٹوٹا برتن کا مرتبان بھی اس کو اٹھا آ جائے تو اس پر کھنچی ہوئی آڑی ترچھی لکیروں سے وہ اس عہد کے آرٹ، اس عہد کے کلچر، اس عہد کی تہذیب، اس دور کے مذہب، اس دور کی سیاست، غرض ہر چیز پر ایک مکمل فلسفہ اور ایک فرضی تاریخ تیار کر دے گا، دوسری طرف اس کی بلادت اور بدذوقی کا یہ عالم ہے کہ خالق کائنات نے ایک ایک پتی پر اپنی حکمت کے جو دفاتر رقم فرمائے ہیں نہ ان کا کوئی حرف اس کی سمجھ میں آتا ہے نہ ان سے اسے کوئی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

'ان فی ذلکم لایات لقوم یؤمنون'۔ فرمایا کہ جو لوگ ایمان لانا چاہیں ان کے لئے ان چیزوں کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں۔ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ کسی حقیقت کے تسلیم کئے جانے کے لئے تنہا یہ کافی نہیں ہے کہ وہ واضح اور ثابت ہے بلکہ اس کے لئے اول شرط یہ ہے کہ آدمی کے اندر اس کو قبول کرنے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ دنیا کو گمراہی علم کے مخفی ہونے کے سبب سے زیادہ پیش نہیں آئی ہے بلکہ زیادہ تر عمل کا سچا اور مضبوط ارادہ مفقود ہونے سے پیش آئی ہے۔

[illegible]

اب آیئے ان نشانیوں پر غور کیجئے جن کی طرف آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

پہلی چیز تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اتنی حکمتوں سے یہ معمور دنیا نہ آپ سے آپ وجود میں آئی ہے، نہ یہ کسی اندھی بہری قوت کا کرشمہ ہے بلکہ اس کے ذرے ذرے کے اندر بے پایاں قدرت اور بے نہایت حکمت کی

جو نشانیاں ہیں وہ زبانِ حال سے شہادت دے رہی ہیں کہ یہ ایک قادر و قیوم اور ایک علیم و حکیم کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔

دوسری چیز یہ نمایاں ہوتی ہے کہ آسمان و زمین، ابر و ہوا، سورج اور چاند، نور اور ظلمت، سردی اور گرمی، بہار اور خزاں ہر چیز پر تنہا اسی قادر و قیوم کی حکمرانی ہے اس لیے کہ ہر چیز اپنے وجود، اپنے نشو و نما اور اپنے بلوغ و کمال میں تمام عناصرِ کائنات کی ایک خاص تناسب کے ساتھ خدمات حاصل کرتی ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ایک ہی بالاتر ارادہ تمام کائنات پر حاوی ہو اور وہ اپنے محیطِ کل علم و حکمت کے تحت ان تمام عناصرِ مختلفہ کے اندر ربط و ہم آہنگی پیدا کرے اور ان کو کائنات کے مجموعی مقصد کے لیے استعمال کرے۔

تیسری چیز یہ سمجھ میں آتی ہے کہ قدرت، علم اور حکمت سے یہ معمور کائنات اپنے ہر گوشے سے پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ نہیں ہے جو محض اس نے اپنا جی بہلانے کے لیے بنایا ہو، جس کے اندر نیکی اور بدی، خیر اور شر، عدل اور ظلم کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ اس قدرت، اس علم اور اس حکمت کا لازمی تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اس کے خالق و مالک کا کامل عدل اور اس کی کامل رحمت ظاہر ہو۔

چوتھی چیز یہ سامنے آتی ہے کہ اس کے اندر رب کریم و رحیم نے ہمارے لیے بغیر ہمارے کسی استحقاق کے محض اپنے فضل و رحمت سے جو نعمتیں اور لذتیں مہیا فرمائی ہیں اور جن سے ہم متمتع ہو رہے ہیں یہ ہم پر ہمارے رب کی شکر گزاری اور اسی کی عبادت و اطاعت کا حق واجب کرتی ہیں۔ جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اس حق کی بابت ہم سے پرسش ہو۔ جس نے یہ حق ادا کیا ہو وہ انعام پائے اور جس نے ناشکری کی ہو وہ اس کی سزا بھگتے۔

پانچویں حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جس پروردگار کی پروردگاری کا یہ عالم ہے کہ اس نے ہمارے اندر جو طلب اور جو داعیہ بھی ودیعت فرمایا اس کا ہمارے گرد و پیش میں بہتر سے بہتر جواب مہیا فرمایا، بھوک دی تو غذا مہیا فرمائی، پیاس دی تو پانی کے دریا بہا دیئے، ذائقہ بخشا تو ذوق کی ضیافت کے نت نئے سامان کئے، ذوقِ نظر بخشا تو کائنات کے گوشے گوشے کو اپنی قدرت کی نیرنگیوں کی جلوہ گاہ بنا دیا، یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسی فیض بخش اور بابرکت ذات جو ہمارے مادی ضرورتوں کا اس سیر چشمی اور فیاضی سے اہتمام کرے، ہماری اس جستجو کا کوئی جواب نہ پیدا کرے جو اس نے ہماری روح اور ہمارے دل کے اندر اپنی ہدایت کے لیے ودیعت فرمائی ہے؟ یہ چیز لازم ٹھہراتی ہے کہ جس طرح اس نے ہماری جسمانی بھوک اور پیاس کے لیے غذا اور پانی کا انتظام فرمایا ہے، اسی طرح ہماری اس روحانی تشنگی

کے بجھانے کا بھی اہتمام فرمائے۔ یہ چیز رسالت کے سلسلۂ رشد و ہدایت کی ضرورت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ
وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ بَدِيْعُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ
وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ
اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ
وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝ ۱۰۰-۱۰۳

[illegible]

'وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ' یعنی کائنات کی ایک ایک چیز تو خدا اور اس کی صفات سے متعلق وہ شہادتیں فراہم کر رہی ہے جو اوپر مذکور ہوئیں لیکن ان لوگوں کی خرد باختگی اور سفاہت کا یہ عالم ہے کہ یہ جنات کو بھی خدا کا شریک بنائے بیٹھے ہیں۔ اہلِ عرب جن چیزوں کو خدا کا شریک مانتے تھے ان میں ملائکہ، جنات، کواکب سب ہی شامل تھے۔ لیکن یہاں سب سے پہلے جنات کا ذکر کر کے قرآن نے شرک کے انتہائی گھنونے پن کو واضح کیا ہے کہ کہاں خدا کی وہ شانیں جو بیان ہوئیں اور کہاں ان بوالفضولوں کی یہ بوالفضولی کہ جن، جنّی اور شیطان کو بھی خدا کا شریک بنا دیا گیا ہے۔ یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ اہلِ عرب جنات کی پرستش بالکل اسی قسم کے تصورات کے تحت کرتے تھے جس قسم کے تصورات کے تحت ہمارے ہاں کی مشرک قومیں بھوت پریت کی پرستش کرتی ہیں۔ فلاں وادی کا جن، فلاں درخت کی جنّی، فلاں ٹیلے کا بھوت، اس قسم کے توہمات ان کے اندر پھیلے ہوئے تھے اور عام طور پر ان کی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لیے ان کو چڑھاوے، نذریں، قربانیاں پیش کی جاتیں اور ان کی جے پکاری جاتی۔ بعض جن تو اتنے خطرناک سمجھے جاتے کہ ان کو راضی رکھنے کے لیے، جیسا کہ آگے آیت ۱۳۷ کے تحت ذکر آئے گا، اولاد تک کی قربانی کی جاتی۔ غالباً یہ ظالمانہ حرکت وہ لوگ کرتے رہے ہوں گے جو اس وہم میں مبتلا ہوتے ہوں گے کہ اگر فلاں جن کو خوش کرنے کے لیے اپنے کسی بیٹے کی قربانی نہ دی تو وہ ان کی ساری اولاد تباہ کر دے گا۔ اس قسم کا وہم دنیا کی وحشی قوموں میں عام رہا ہے۔

[illegible]

'وَخَلَقَهُمْ' میں 'و' حالیہ ہے اور اس کی حیثیت کلام کے بیچ میں جملہ معترضہ کی ہے۔ یہ بات اتنی گھنونی تھی کہ بلا تاخیر اس کی تردید فرما دی کہ یہ لوگ جنوں کو خدا کا شریک بناتے ہیں حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا ہے۔ خدا ہی کی پیدا کی ہوئی کوئی چیز آخر اس کی خدائی میں شریک کیسے بن سکتی ہے! یہ واضح رہے کہ اہلِ عرب ساری کائنات کا خالق خدا ہی کو مانتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا یہ عقیدہ اصل عقیدے سے صرف تضاد ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ یہ تضاد نہایت بھونڈے قسم کا تھا۔ آخر خدا اپنی دنیا پیدا کر کے اس کو اپنے

ہی پیدا کئے ہوئے جنوں کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

'وخرقوا له بنين وبنات بغير علم'۔ 'خرق الکذب' کے معنی جھوٹ گھڑنے اور جھوٹ تراشنے کے ہیں۔ اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کا درجہ دیتے تھے اور اسی وہم کی بنا پر ان کی مورتیں بنا کر دیویوں کی حیثیت سے ان کی پوجا کرتے تھے۔ اگرچہ یہاں اصلاً زیر بحث مشرکین عرب ہی کے توہمات ہیں لیکن بیٹیوں کے ساتھ بیٹوں کا ذکر کرکے قرآن نے کلام میں وسعت پیدا کر دی ہے اور اس طرح ان قوموں کے عقائد کی بھی تردید ہو گئی ہے جو خدا کے لئے بیٹے مانتی تھیں جن کی ایک مثال عیسائی ہیں۔ 'بغیر علم' کا مطلب یہ ہے کہ یہ باتیں وہ بغیر کسی دلیل نقل و عقل کے مانتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے: 'بغیر سلطان اتاهم'۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے وہ تو عقل و فطرت کا بدیہی تقاضا ہے۔ خدا کو مانے بغیر نہ اس کائنات کا معمہ حل ہوتا نہ عقل و فطرت کو اطمینان حاصل ہوتا۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے اور یہ موحد و مشرک دونوں کے ہاں مسلم ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اس کائنات میں کسی اور کی بھی حصہ داری ہے تو یہ چیز دلیل کی محتاج ہے اور یہ دلیل فراہم کرنا اس فریق کی ذمہ داری ہے جو اس کا مدعی ہے۔ یہ دلیل دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ یا تو خود خدا کی طرف سے اس بات کی کوئی قابلِ اطمینان شہادت موجود ہو کہ اس نے فلاں اور فلاں کے لیے اپنی اس کائنات میں حصہ داری تسلیم کی ہے یا ان کو وہ اپنے بیٹے یا بیٹیاں مانتا ہے یا عقل و فطرت کے اندر ان کے حق میں کوئی دلیل موجود ہو۔ اگر ان دونوں چیزوں میں سے کوئی چیز بھی موجود نہ ہو تو آخر کیا شامت آئی ہوئی ہے کہ مفت میں کسی کو خدا یا شریک خدا مان کر اس کی غلامی کا پٹا بھی اپنی گردن میں ڈال لیجئے۔ خدا کوئی تفریح کی چیز نہیں ہے۔ اس کو تو اس لیے مانا جاتا ہے کہ اس کے مانے بغیر چارہ نہیں۔ آخر دوسروں کے ماننے کے لئے کیا مجبوری ہے کہ ان کو مانئے۔ بلا دلیل تو آدمی اپنی گز بھر زمین میں کسی کی حصہ داری تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا تو آخر خدا کی خدائی اور اس کے اختیار و اقتدار میں کسی کو کس طرح حصہ دار مان لے۔

تنزیہ کے اندر توحید کی دلیل

'سبحنه وتعالى عما يصفون'۔ 'سبحنه' کے لفظ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ یہ تنزیہ کا کلمہ ہے یعنی خدا ان باتوں سے پاک، بری اور بالا ہے جو یہ مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ بظاہر تو صرف ایک تنزیہی کلمہ ہے لیکن غور کیجئے تو اس کے اندر توحید کی بہت بڑی دلیل بھی ہے۔ عقل و فطرت کا بدیہی تقاضا ہے کہ کسی چیز کی طرف کوئی ایسی صفت منسوب نہ کی جائے جو اس کی ثابت، مسلم اور بدیہی صفات کے ضد یا منافی ہو۔ اگر ایسا کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی ہی مانی ہوئی ایک حقیقت اپنے ہی دوسرے مفروضہ سے باطل ہو جاتی ہے۔ اگر ایک شخص بادشاہ ہے تو اس کی طرف غلامی کی صفات منسوب نہیں ہو سکتیں۔ فرشتہ ہے تو اس کو شیطان کی صفات سے ملوث نہیں کیا

جا سکتا۔ اسی طرح جو ذات خالق، مالک، قدیر، علیم، اور کریم و رحیم ہے اس کو ان صفات سے متصف کرنا جو مخلوق کی صفات ہیں اس کی ان تمام صفات کی نفی کے ہم معنی ہے جن کا ماننا از روئے عقل و فطرت واجب ہے اور جن کی نفی سے انسان ان تمام تاریکیوں میں پھر گھر جاتا ہے جن سے ان صفات کے علم کی روشنی ہی نے اس کو نکالا تھا۔ اگر خدا کو خدا ماننے کے بعد بھی جنات اور فرشتوں کو اس کا شریک قرار دے دیا گیا اور اس کو بیٹوں بیٹیوں کا باپ بنا دیا گیا تو پھر وہ خدا کہاں رہا! پھر تو اس کے کفو، ہم سر بھی پیدا ہو گئے، اس کی ذات برادری کے شریک بھی نکل آئے اور اس کے مدمقابل اور حریف بھی اٹھ کھڑے ہوئے!۔

'بدیع السموت والارض'۔ 'بدیع' کے معنی ہیں عدم سے وجود میں لانے والا۔ یعنی خدا آسمانوں اور زمین اور تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ جب کچھ نہ تھا تب خدا تھا۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے تو کسی مخلوق کو بیٹوں بیٹیوں کا درجہ کس طرح حاصل ہوا؟ اور وہ خدا کی خدائی میں شریک کس راہ سے ہو گئے!

شرک کی حماقت در حماقت

'انی یکون له ولد ولم تکن له صاحبة'۔ یعنی خدا کے لئے اولاد ماننا ایک اس سے بھی بڑی حماقت کے لئے راہ کھولتا ہے۔ وہ یہ کہ خدا کے لئے (نعوذ باللہ) بیوی بھی مانی جائے۔ یہ غنیمت تھی کہ مشرکین عرب اپنی تمام مشرکانہ خرافات کے باوجود خدا کے لئے کوئی بیوی نہیں مانتے تھے۔ قرآن نے اسی پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ جب خدا کے کوئی بیوی نہیں اور تم بھی اس کے لئے کسی بیوی کے قائل نہیں تو پھر یہ اس کے بیٹے بیٹیاں تم نے کہاں سے گھڑ کر دیئے! پھر تو جو بھی ہو گا، فرشتے ہوں یا جنات یا انسان، سب خدا کی مخلوق ہوئے اور جب مخلوق ہوئے تو سب کو مخلوق ہی کے درجے میں رکھو، ان میں سے کسی کو بیٹے بیٹیاں قرار دے کر خدا کی ذات اور اس کی خدائی میں کیوں شریک بنائے دیتے ہو!

خالق ہی عالم ہے [illegible]

'وخلق کل شیء وهو بکل شیء علیم'۔ یہ شرک اور شرکاء کی کلی نفی کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا ہی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور اسی کا علم ہر چیز کو محیط ہے تو آخر وہ ضرورت کیا ہے جس کے لیے ان شرکاء کا سہارا ڈھونڈھا گیا ہے۔ یہ تصور کرنے کی تو کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خدا نے پیدا کرنے کو تو کر دیا لیکن اس کو ہر چیز اور ہر شخص کی خبر نہیں ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے وہ لازماً ہر چیز کو جانتا بھی ہے۔ اسی بات کو دوسری جگہ فرمایا ہے۔ 'الا یعلم من خلق'۔ ملک ۱۴ (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا)۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مان کر ان کی جو پوجا کرتے تھے تو اس لیے نہیں کہ وہ ان کو خالق مانتے تھے بلکہ صرف اس لیے کہ یہ خدا کے چہیتے ہیں اور یہ اپنے پرستاروں کی ضروریات، ان کے مسائل اور ان کی آرزوؤں سے خدا کو باخبر کرتے اور اس سے منواتے ہیں۔ فرمایا کہ جس نے پیدا کیا ہے تو وہ اپنی مخلوق کی ہر چیز

سے واقف بھی ہے تو اس کو چھوڑ کر کسی اور کے دروازے پر جانے کی کیا ضرورت ہے!۔

'ذٰلکم اللہ ربکم لا الٰہ الا ھو الآیۃ'۔ فرمایا کہ وہی خدا جس نے تمہیں پیدا کیا ہے وہی تمہارا رب بھی ہے۔ پھر اس کا کیا تُک ہے کہ خالق تو اس کو مانو اور رب دوسروں کو بناؤ۔ وہی خالق ہے تو اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز پر نگراں ہے تو امید ہو یا بیم دونوں کا مرجع اسی کو بناؤ۔

'لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار'، یعنی اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ خدا نظر تو نہیں آتا تو یہ چیز ماننے ہونے کی نہیں۔ تمہاری نگاہیں تو بے شک اس کو پکڑنے سے قاصر ہیں لیکن وہ تمہاری نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ جو اسے دیکھنا چاہتا ہے وہ تو اگرچہ اس کو نہیں دیکھ پاتا لیکن وہ ڈھونڈنے والے کو دیکھ لیتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اعبد ربک کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (اپنے رب کی بندگی اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ بہرحال تمہیں دیکھ رہا ہے) یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شرک و بت پرستی کے محرکات میں سے ایک اہم محرک ابتداء سے یہ بھی رہا ہے کہ انسانوں نے خدا کو کسی پیکرِ محسوس میں دیکھنا چاہا ہے۔ اسی چیز نے انسان اور خدا کے درمیان واسطوں اور وسیلوں کو جنم دیا۔ جب خدا کہیں آنکھوں سے نظر نہیں آیا تو نا سمجھ لوگوں نے ان چیزوں کے پیکر تراش کر ان کی پرستش شروع کر دی جن کو وہ خدا کی ذات یا صفات کا مظہر یا اس کا اوتار سمجھے چنانچہ زمانۂ حال کے ہند و فلسفی بت پرستی کے جواز کی یہی توجیہ اب بھی پیش کرتے ہیں۔ اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں جن صوفیوں نے تصورِ شیخ کی بدعت اختیار کی ہے وہ بھی اپنی اس بدعت کی تائید میں یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ انسان چونکہ پیکرِ محسوس کا خوگر ہے اس وجہ سے تصورِ شیخ تصورِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ قرآن نے یہاں یہی غلط فہمی رفع فرمائی ہے کہ خدا دیکھنے اور چھونے کی چیز نہیں ہے۔ اس سے قرب و بُعد دل کے واسطے سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان اس کو یاد رکھے تو وہ خدا سے قریب ہوتا ہے، اگر بھول جائے تو دور ہو جاتا ہے۔ اگر آدمی کی نگاہ اس کو نہیں دیکھتی تو اس سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اس کی نگاہیں آدمی کو ہر جگہ اور ہر وقت دیکھتی ہیں اور انسان کے اعتماد کے لئے یہ بس ہے۔

[illegible]

'وھو اللطیف الخبیر' یہ اوپر کی بات کی دلیل صفاتِ الٰہی سے بیان فرمائی کہ وہ بڑا باریک بین اور بڑی خبر رکھنے والا ہے۔ کوئی چیز کتنے ہی پردوں میں ہو اس کی نگاہیں اس تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور کوئی چیز کتنی ہی مخفی ہو وہ اس سے ہر آن و ہر لحظہ باخبر ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اس کے لئے ان مزعومہ وسائط و وسائل کی ضرورت نہیں۔ تم اس کے طالب بنو وہ خود تمہیں پا لے گا۔ تمہاری نگاہیں بے شک اس کو پانے سے قاصر ہیں، لیکن اس کی نگاہیں تمہاری نگاہوں کو پا لینے سے قاصر نہیں ہیں۔ وہ ہر جگہ سے ان کو

اچک لیتی ہیں۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ
وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝ وَكَذٰلِكَ
نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۱۰۴-۱۰۵

'قد جاءکم بصائر من ربکم'، لفظ 'بصیرۃ' قرآن میں سوجھ بوجھ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور سوجھ بوجھ پیدا کرنے والے دلائل و براہین کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ اسی دوسرے معنی میں ہے اور مراد اس سے قرآن حکیم اور اس کی آیات ہیں جو آنکھوں کے پردے ہٹا دینے والی ہیں بشرطیکہ کوئی آنکھیں کھولنا چاہے۔

'فمن ابصر فلنفسہ ومن عمی فعلیھا وما انا علیکم بحفیظ' یعنی ان سے فائدہ اٹھا کر جو اپنی بصیرت کی آنکھیں کھولے گا تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور جو بدستور اندھا بنا رہے گا تو اس کا خمیازہ خود ہی بھگتے گا، اس کی کوئی ذمہ داری پیغمبر پر نہیں ہے۔

[illegible]

آیت کے آخری الفاظ 'وما انا علیکم بحفیظ' اس بات پر دلیل ہیں کہ اس آیت کی وحی براہِ راست لسانِ نبوت پر ہے۔ یوں ارشاد نہیں ہوا کہ ان لوگوں سے کہہ دو بلکہ کہنے کی بات پیغمبر نے خود برملا ارشاد فرما دی۔ وحی کی یہ قسم درجۂ نبوت کے غایتِ قرب و اتصال کی دلیل ہوتی ہے گویا منبعِ فیضِ الٰہی کا فیضان خود زبانِ رسالت سے چھلک پڑتا ہے۔ 'گفتۂ او گفتۂ اللہ بود' شاید اسی حقیقت کی تعبیر ہے۔ وحی کی اقسام و انواع پر انشاء اللہ ہم کسی دوسرے مقام پر بحث کریں گے۔ مولانا فراہیؒ نے اس پر اپنے مقدمۂ تفسیر میں ایک نہایت لطیف بحث فرمائی ہے۔

'وکذٰلک نصرف الآیات'۔ 'تصریفِ آیات' کی وضاحت مختلف مقامات میں ہو چکی ہے یعنی اللہ کی نشانیوں کو مختلف پہلوؤں اور گوناگوں اسلوبوں سے واضح کرنا۔ یہاں 'کذٰلک' کا اشارہ توحید، معاد اور رسالت کے انہی دلائل کی طرف ہے جو اوپر تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

لفظ درس کی تحقیق

'ولیقولوا درست'۔ 'درس' کے اصل معنی تو گھسنے اور مٹنے کے ہیں۔ 'درس الرسم' کے معنی ہوں گے 'محاہ' نشان کو مٹا دیا۔ آدمی جب کسی چیز کو کثرت سے بار بار پڑھتا ہے، بالخصوص جب اس پر انگلی رکھ کے ایک ایک حرف کو متعین کرتے ہوئے پڑھتا ہے، جیسا کہ مذہبی صحیفوں کی تلاوت کے لیے رواج ہے تو بالعموم وہ نسخے گھس جاتے ہیں اس وجہ سے لفظ 'درس' کسی کتاب کو اچھی طرح 'یاد' کرات و مرات پڑھنے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ لغت میں اس بات کو یوں تعبیر کرتے ہیں 'درس الکتاب' اقبل علیہ یحفظہ'

کسی کتاب کو پڑھنا خود اپنے لیے بھی ہو سکتا ہے اور دوسروں کو سنانے کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں قرأت اور تلاوت کے الفاظ بھی ان دونوں ہی مفہوموں میں استعمال ہوئے ہیں۔ 'و لیقولوا' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنی آیتیں مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ سمجھنا چاہیں تو سمجھیں اور اگر اپنی روش پر اڑے رہنا چاہیں تو کم از کم اس بات کے تو وہ قائل ہو جائیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کے سنا دیا۔ نیز اس لیے ہم ان کی اچھی طرح وضاحت کر رہے ہیں کہ جو علم کے طالب ہیں وہ ان سے علم حاصل کریں۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنا کوئی رسول بھیجتا ہے تو اس کے ذریعے سے وہ مخاطب قوم پر اپنی حجت تمام کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے دل پکار اٹھتے ہیں کہ رسول نے احقاق حق کا حق ادا کر دیا، زبان سے وہ اس کا اقرار کریں یا نہ کریں۔ یہاں 'و لیقولوا' سے یہی دل کا اقرار مراد ہے۔ دل کے اس اقرار کے باوجود زبان و عمل سے جو قوم رسول کی تکذیب پر اڑی رہتی ہے، سنت الٰہی یہ ہے کہ وہ قوم ہلاک کر دی جاتی ہے۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۭ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۱۰۶-۱۰۷

پیغمبر کی طرف التفات

یہ پیغمبر کی طرف التفات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم وحی الٰہی پر جمے اور اپنے موقف حق پر ڈٹے رہو۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور ان مشرکین کی مخالفت کی کوئی پروا نہ کرو۔ ان سے اعراض کرو اور یہ بات یاد رکھو کہ اگر اللہ اپنے دین کے معاملے میں جبر کو پسند کرتا ہوتا تو ان میں سے کوئی بھی شرک پر قائم نہ رہ سکتا۔ وہ سب کو توحید و اسلام کی صراط مستقیم پر چلا دیتا لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ وہ لوگوں کو اس معاملے میں اختیار دے کر آزمائے کہ کون توحید کی راہ اختیار کرتا ہے، کون شرک کی؟ تو جب حکمت الٰہی نے یہ چاہا ہے تو تم ان کے معاملے میں کیوں پریشان ہو؟ تمہاری ذمہ داری حق کو واضح طور پر پہنچا دینے کی ہے اور یہ فرض تم انجام دے رہے ہو۔ تم ان کے ایمان کے ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو کہ یہ ایمان نہ لائے تو اس کی پرسش تم سے ہو اور نہ تم ان کے ایمان کے ضامن بنے ہو کہ کل کو ان کے باب میں خدا کے آگے جواب دہی کرنی ہے۔ تم اپنا فرض انجام دو، جو ان کی ذمہ داری ہے وہ ان پر چھوڑ دو، اگر وہ اپنی ذمہ داری نہ ادا کریں گے تو اس کا خمیازہ خود بھگتیں گے۔

لفظ 'وکیل' کے مختلف معانی پر ہم دوسرے مقام پر گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں یہ ضامن کے مفہوم میں ہے یعنی نہ خدا نے تم کو ان پر داروغہ مقرر کیا، نہ تم ان کے ضامن بنے تو تم کیوں پریشان ہو؟

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ ۱۰۸

مسلمانوں کو ایک اہم نصیحت

'ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم' مسلمانوں کو اسی طرح کی ایک برمحل ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت سورہ نساء کی آیت ۱۴۰ اور آیت ۱۴۸ میں گزر چکی ہے۔ جس طرح مذکورہ آیات سے اوپر منافقین کے رویہ پر شدت کے ساتھ تنقید ہوئی تو ساتھ ہی مسلمانوں کو ان سے سلام کلام قطع کرنے اور تعیین اشخاص کے ساتھ ان کو برا بھلا کہنے کی ممانعت کر دی گئی کہ مبادا یہ بات اصول کے حدود سے نکل کر ذاتیات کے دائرے میں داخل ہو جائے، اسی طرح یہاں اوپر شرک اور مشرکین پر جو سخت تنقید ہوئی ہے اس کا تقاضا یہ ہوا کہ مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی جائے کہ شرک کی تردید یہ رنگ نہ اختیار کرنے پائے کہ زیادہ پرجوش مسلمان ان چیزوں کو سخت سست کہنا شروع کر دیں جن کو مشرکین پوجتے ہیں۔ یہ ہدایت اس وجہ سے ضروری تھی کہ یہ دور، جیسا کہ آیات سے واضح ہے، بحث کی گرماگرمی کا تھا اور بحث کی گرماگرمی میں حدود کا احترام بالعموم ملحوظ نہیں رہتا درآنحالیکہ مسلمانوں پر، جیسا کہ سورہ مائدہ آیت ۸ سے واضح ہے، واجب ہے کہ وہ دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرنے میں سرِ مو حدود سے تجاوز نہ کریں۔ اس ہدایت کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ دعوت کے نقطۂ نظر سے بابرکت اور نتیجہ خیز طریقہ یہی ہے کہ بات اصول و عقائد ہی تک محدود رہے تاکہ مخاطب کے اندر کسی بیجا عصبیت کا جذبۂ جاہلی ابھرنے نہ پائے۔ اگر توحید کا تقاضائے عقل و فطرت ہونا اور شرک کا بالکل بے ثبات و بے بنیاد ہونا ثابت ہو جائے تو ان مزعومہ معبودوں کی خدائی آپ سے آپ ختم ہو جاتی ہے اور ان کو سب و شتم کا ہدف بنانے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ برعکس اس کے اگر بحث کے جوش میں ان چیزوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیجئے، جن کی عقیدت پشتہا پشت سے مشرکین کے دلوں میں رچی بسی ہوئی تھی تو اس کا نفسیاتی اثر ان پر یہی پڑ سکتا تھا کہ وہ مشتعل ہو کر نعوذ باللہ خدا کو گالیاں دینے لگتے اور پھر کوئی بات بھی سننے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ 'عدوا بغیر علم' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر چند مشرکین خدا کو خدا مانتے ہیں لیکن اشتعال میں حدود کا ہوش کسے رہتا ہے! وہ اندھے ہو کر سارے حدود توڑ کے رکھ دیں گے بالخصوص جبکہ انہیں خدا کی صفات اور اس کے حقوق کا کوئی علم بھی نہیں ہے۔

یہاں بھی غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مشرکین کے معبودوں کو برا بھلا کہنے کا کوئی تک نہیں ہے۔

اگر وہ محض خیالی اور وہمی چیزیں ہیں تو سایہ سے لڑنے کا فائدہ کیا اور اگر وہ فرشتوں، نبیوں اور بزرگوں کے زمرے سے تعلق رکھنے والے ہیں تو ان کو برا بھلا کہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ الغرض یہ چیز دعوت کے نقطۂ نظر سے بھی غلط، عقل و انصاف کے پہلو سے بھی غلط اور سب سے زیادہ اس پہلو سے غلط ہے کہ مشرکین کے جھوٹے خداؤں کو گالیاں دینے والے درحقیقت اپنے سچے خدا کو گالیاں دلوانے کی راہ کھولتے ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن میں بتوں کی بے حقیقتی، ان کی ناطاقتی اور ان کی بے بسی کی تصویر جو قرآن میں کہیں کہیں کھینچی گئی ہے وہ اس کے تحت نہیں آتی۔ اول تو روکا جس چیز سے گیا ہے وہ سب و شتم ہے نہ کہ تنقید و توضیح، دوسرے یہاں آیت میں پیش نظر وہ فرضی یا واقعی ہستیاں ہیں جن کو مشرکین معبود مان کر پکارتے تھے۔ 'الذین یدعون من دون اللہ' کے الفاظ سے یہ بات خود نکل رہی ہے۔

'کذلک زینا لکل امۃ عملھم' مطلب یہ ہے کہ ہر قوم کو اپنی روایات، اپنے رسوم اور اپنے معتقدات عزیز ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی علانیہ تحقیر و توہین سے وہ مشتعل ہوتی ہے۔ اس طرح کی کسی چیز پر تنقید کرتے ہوئے ناقد کو لازماً یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ معاملے کے وہی پہلو زیر بحث آئیں جو آنے چاہئیں اور اس انداز میں آئیں جو شائستہ بحث و تنقید کے شایان شان ہیں۔ وہ انداز نہیں ہونا چاہیے جو جذبات کو مجروح کرنے والا اور دلوں کو دکھانے والا ہو۔

فطری تقاضوں کے جائز حدود کی رعایت

یہاں 'تزیینا' کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر قوم کے اندر اپنی مالوفات سے دل بستگی اور اپنی روایات ملی و اجتماعی کے لئے یہ عصبیت ایک حد تک فطری چیز ہے۔ یہ نہ ہو تو قومی و ملی وحدت وجود ہی میں نہیں آسکتی۔ خاندانوں، قوموں اور وطنوں کی شیرازہ بندی اسی چیز سے ہوتی ہے۔ یہ معدوم ہو جائیں تو افراد ہوا میں اڑتے ہوئے پتوں کے مانند ہو جائیں۔ اس وجہ سے اس چیز کا ایک مقام ہے جو تقاضائے فطرت ہے اور اس کی رعایت ملحوظ ہونی چاہیے۔ اس سے تعرض اسی حد تک ہونا چاہیے جس حد تک یہ حق کے خلاف ہے۔ اور اس انداز میں ہونا چاہیے جس سے خود اس کا واجبی حق مجروح نہ ہو۔ یاد ہوگا ہم دوسرے مقام میں بحث کر آئے ہیں کہ قرآن نے باپ دادا کے طریقے کی بھی اہمیت تسلیم کی ہے، بس یہ مطالبہ کیا ہے کہ اس کو ان چیزوں سے پاک کر کے اختیار کیا جائے جو اس میں عقل و فطرت اور تعلیم الٰہی کے خلاف گھس آئی ہوں۔ اسی طرح یہاں مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ قوم کے عقائد و اعمال کی تطہیر تو ضروری ہے لیکن یہ کام نہایت حکمت و دانش کے ساتھ ہونا چاہیے، ہر قوم کو اپنی روایات سے گہری وابستگی ہوتی ہے اور یہ چیز اس فطرت کے

تقاضوں میں سے ہے جو خود خدا نے انسان کے اندر ودیعت کی ہے اس وجہ سے یہ تو ضروری ہے کہ جو خلاف فطرت چیز فطرت کے اندر گھس آئی ہے وہ اس سے دور کی جائے لیکن خود فطرت پر کوئی جارحانہ حملہ کرنے کی غلطی نہ کی جائے ورنہ اس سے کام بننے کے بجائے اور بگڑ جایا کرتا ہے۔

'ثم الی ربھم مرجعھم الایۃ': پوری آیت سامنے رکھ کر اس فقرے پر غور کیجئے تو مطلب یہ نکلے گا کہ مسلمانوں کو دعوت کے جوش میں اپنے حدود سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ اگر لوگ حق واضح ہو جانے کے باوجود اپنی غلطیوں ہی پر مصر رہیں گے تو مجرم وہ ٹھہریں گے اور قیامت کے دن خدا کے آگے جواب دہی ان کو کرنی ہوگی، اہل ایمان پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی، پھر وہ کیوں ضرورت سے زیادہ مضطرب اور اپنی ذمہ داری کے حدود سے متجاوز ہوں؟ یہ مسلمانوں کو اسی طرح کی تسکین و تسلی ہے جس طرح کی تسکین و تسلی اوپر والی آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔

ہم سے طلب فرمائیے
تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

* اسلامی قانون کی تدوین
صفحات ۱۶۰ : قیمت ۳ روپے
سستا ایڈیشن : ۲.۰۰

* تزکیۂ نفس
صفحات : ۳۴۴
قیمت : -/۶ روپے

تفسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ
بڑا سائز : صفحات : ۳۶
ھدیہ : ۷۵ پیسے

دار الاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ، اسلام پورہ - لاہور ۱

ہم سے طلب فرمایئے
سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مختصر ترین لیکن جامع ترین کتاب
النبی الخاتم
تالیف : مولانا سید مناظر احسن گیلانی
۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۸۰ : کاغذ سفید : قیمت ۳/- روپے

انوارِ مجددی
یعنی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے چیدہ چیدہ مکتوبات، سلیس اور شگفتہ ترجمہ مع تعارف مکتوب الیہم وحواشی مفیدہ :
از پروفیسر یوسف سلیم چشتی
سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات : ۳۸۴ مجلّد مع ڈسٹ کور - قیمت : چار روپے صرف

دعوتِ حق حصہ اول
افادات حضرت شیخ الحدیث مولانا عبد الحق مدظلہ - مہتمم دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک و امیر الجمعیۃ خدام الدین نوشہرہ
مرتبہ : مولانا سمیع الحق
شائع کردہ : مکتبہ حکمۃ الاسلامیہ نوشہرہ
قیمت ۲/-

تصانیف : علامہ سید محمود احمد عباسی
حقیقت خلافت و ملوکیت
سید ابو الاعلیٰ مودودی کی تالیف خلافت و ملوکیت کا مسکت جواب
مستند تاریخی حقائق و واقعات کی روشنی میں
سائز ۲۲×۳۶/۱۶ صفحات ۵۶۸ : مجلد
قیمت قسم اوّل سفید کاغذ مع ڈسٹ کور -/۱۱ روپے
" دوم نیوز پرنٹ ۶/۷۵ "

تحقیق مزید
بہ سلسلہ خلافت معاویہؓ و یزیدؒ
بڑی تقطیع
صفحات : ۵۰۴ مجلّد
قیمت : آٹھ روپے
(محصولڈاک اس کے علاوہ)

دار الاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ، اسلام پورہ (سابق کرشن نگر) لاہور

اسلامی ریاست میں

جان، مال، ناموس اور ملک کی حفاظت

و

قانونی و معاشرتی مساوات

مولانا امین احسن اصلاحی

زیر طبع کتاب ’اسلامی ریاست‘ کے ایک باب سے

۱۔ جان، مال اور ناموس کی حفاظت

ایک شہری کا سب سے مقدم اور سب سے مقدس حق یہ ہے کہ اس کے جان و مال اور ناموس کی حفاظت کی ریاست کی طرف سے ضمانت دی جائے کہ ریاست نہ تو اس کی ان چیزوں پر خود ہاتھ اٹھائے گی اور نہ کسی اور کو ان پر ہاتھ ڈالنے دے گی۔ اسلامی ریاست یہ ذمہ داری، جیسا کہ حدیثوں سے واضح ہو چکا ہے، تنہا اپنی ضمانت پر نہیں اٹھاتی ہے بلکہ اس کے ساتھ خدا اور اس کے رسول کی ضمانت بھی شامل کرتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ریاست اس عہد کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کرتی ہے تو گویا اس عہد کو توڑتی ہے جو اس نے اللہ اور اس کے رسول کے نام پر باندھا ہے اور اس شخص کے جان و مال پر حملہ کرتی ہے جس کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری اس نے خدا کی طرف سے اٹھائی ہے۔ اوپر والی حدیث کے یہ الفاظ پھر ملاحظہ فرمائیے :-

فذلك المسلم الذي له ذمة الله ورسوله، فلا تخفروا الله في ذمته	پس یہ وہ مسلم ہے جس کے جان و مال کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے، تو خبردار، اللہ کے ساتھ اس کی دی ہوئی ضمانت میں غداری نہ کرو۔

ان چیزوں کے احترام کی تاکید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے فرمائی ہے :-

كل المسلم على المسلم حرام	مسلمان کی ہر چیز مسلمان پر حرام ہے، اس کا

دمہ و مالہ و عرضہ	خون بھی، اس کا مال بھی اور اس کی آبرو بھی۔
(مسلم کتاب البر والصلۃ)	

اور اس حُرمت اور اس احترام کا درجہ آپؐ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ جس طرح عرفہ کے دن کو خدا نے محترم کیا ہے، کسی مُجرم کے لئے جائز نہیں ہے کہ اس کی حُرمت کو بٹہ لگائے اسی طرح ہر مسلمان کی جان و مال اور اس کی آبرو کو اللہ نے محترم بنایا ہے، کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کی جان و مال اور آبرو پر ہاتھ ڈالے۔ حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:-

فان دماءکم واموالکم واعراضکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا	جس طرح آج کا یہ دن محترم ہے اسی طرح تمہاری جان و مال اور آبرو ایک دوسرے کے لئے محترم ہے۔

اِن چیزوں کی حفاظت کی ذمہ داری کے ساتھ "الا بحقھا و حسابھم علی اللہ" (مگر شریعت کے مقرر کردہ حقوق کے تحت اور ان کے باطن کا محاسبہ اللہ کے ذمہ ہے) کی قید لگا کر آپؐ نے غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کو ہمیشہ کے لئے واضح فرما دیا کہ ریاست کسی شہری کی ان چیزوں میں کوئی مداخلت صرف اسلامی قانون کے اندر ہی کر سکتی ہے اور اس کے لیے اسے بہرحال شہریوں کے ظاہری رویہ ہی کی بنا پر فیصلہ کرنا ہوگا، ان کے باطن کو زیر بحث لانے کا اس کو کوئی حق حاصل نہیں ہے، الا یہ کہ ظاہر ہی میں کوئی علامت ایسی موجود ہو جو نفاق کا پتہ دیتی ہو۔

۳۔ ملک کی حفاظت

ہر شہری کی ملک ذاتی (PRIVATE PROPERTY) جس کا وہ از روئے شریعت اسلامی جائز طریقہ پر مالک ہوا ہے، بالکل محفوظ ہوگی اور شریعت کے خلاف حکومت اس میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔ قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں فرماتے ہیں:-

ولیس للامام ان یخرج شیئاً من احد الا بحق ثابت معروف	امام (حکومت) کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ثابت شدہ قانونی حق کے بغیر کسی شخص کے قبضہ سے اس کی کوئی چیز نکالے۔
(کتاب الخراج ص۶۶)	

اگر کسی شخص کی ملک ذاتی پر حکومت کو کسی اجتماعی ضرورت کے لیے قبضہ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی تو وہ یا تو مالک کی مرضی سے اس پر قبضہ کرے گی یا اس کو اس کی ملکیت کا معقول معاوضہ دے گی۔ اس بات کا ثبوت مختلف مواقع پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے ملتا ہے۔

جعرانہ ہوازن کی عورتیں اور بچے مسلمانوں کی قید میں آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تقسیم کرنے میں چند روز اس خیال سے توقف فرمایا کہ اگر ان کے اولیاء کی طرف سے درخواست کی گئی تو ان کو واپس کر دیا جائے گا لیکن جب ان کی طرف سے کوئی درخواست نہیں آئی تو آپ نے ان کو مسلمانوں کے اندر تقسیم کر دیا۔ بعد میں ان کے اولیاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے قیدیوں کی رہائی کی درخواست کی۔ آپؐ نے ان کو رہا فرما دینا چاہا لیکن قیدی حکومت کی اجتماعی ملکیت سے نکل چکے تھے اور تقسیم ہو کر افرادی ملکیت بن چکے تھے اس وجہ سے آپؐ نے ان قیدیوں کی رہائی کا حکم تو فوراً دے دیا جو حکومت کے قبضہ میں تھے لیکن جو قیدی افرادی شخصی ملک بن چکے تھے ان کی رہائی کے لئے آپ نے مسلمانوں کے سامنے تقریر فرمائی کہ تم میں سے جو لوگ اپنے قیدیوں کو بغیر کوئی معاوضہ لیے چھوڑنے پر راضی ہوں وہ تو چھوڑ دیں لیکن جو لوگ بلا معاوضہ لئے چھوڑنے پر راضی نہ ہوں تو فَے کا پہلا مال جو ہمارے قبضہ میں آئے گا اس سے ہم ان کا معاوضہ پُورا ادا کریں گے۔

جنگ حُنین کے لیے جاتے ہوئے آپؐ نے صفوان بن امیّہ سے زرہیں حاصل کی تھیں، اس نے کہا "اغصبٌ یا محمد" کیا بلا معاوضہ لینے کا ارادہ ہے اے محمدؐ! آپؐ نے فرمایا نہیں بل عاریۃ مضمونۃ۔ یہ مستعار ہیں اور جو ان میں سے ضائع ہوں گی ان کا معاوضہ دیا جائے گا۔

اسی طرح قریش کے ایک تجارتی قافلہ کا مال مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ یہ قافلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابو العاص کی سرکردگی میں تھا۔ ابو العاص نے اس مال کی واپسی کے لیے مدینہ جا کر کوشش کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اہم سیاسی مصالح کی بنا پر مال واپس کر دینا چاہا۔ لیکن اس کی واپسی کا حکم نہیں دیا بلکہ مسلمانوں سے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو اس کو واپس کر دو۔

۴۔ قانونی مساوات

اسلامی ریاست کا ہر شہری، خواہ امیر ہو یا غریب، شریف ہو یا وضیع، امیر ہو یا مامور، قانون کی نظر میں بالکل مساوی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر شخص اور ہر طبقہ بغیر کسی امتیاز کے، ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام عدالت کے تحت ہے۔ نہ مختلف طبقات کے لیے قانون کی نوعیت میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے نہ غربت و امارت یا اس قسم کی کسی اور وجہ کی بنا پر قانون کے اجراء و نفاذ میں سرِ مو کوئی فرق واقع ہو سکتا ہے۔ برطانیہ کا بادشاہ۔ بلکہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی ریاست کا حکمرانِ اعلیٰ خواہ وہ صدر ہو یا جنرلسمو۔ قانون سے بالاتر سمجھا جاتا ہے اور اس کی ذات کے خلاف کسی عدالت میں دعوے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اسلام میں اوروں کا تو کیا ذکر خود پیغمبرؐ کو یہ درجہ

حاصل نہیں ہے کہ قانون کے معاملہ میں عام مسلمانوں سے اس کا مقام کچھ نمایاں ہو۔ اگر عام مسلمانوں سے اس کا درجہ اونچا ہے تو اس پہلو سے ہے کہ وہ اوّل المومنین اور اوّل المسلمین یعنی سب سے پہلے ایمان لانے والا اور قانون کی سب سے زیادہ اطاعت کرنے والا ہے۔ قرآن مجید میں قانون پر ایمان لانا جس طرح عام مسلمانوں کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے اسی طرح پیغمبر کے لئے بھی ضروری قرار دیا گیا ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ	رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اللہ کی طرف سے
مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۲۸۵۔ بقرہ)	اتاری گئی اور مومنین بھی اس پر ایمان لائے۔

رہی قانون کی اطاعت تو اس معاملہ میں رسول کی ذمہ داری عام مسلمانوں کی نسبت کہیں زیادہ سخت ہے یہاں تک کہ اس کو نافرمانی کی صورت میں دنیا اور آخرت دونوں جگہ دوگنے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس قانون کے داعی تھے اس پر سب سے بڑھ کر عمل کرنے والے اور اس کی نافرمانی کے نتائج سے سب سے زیادہ ڈرنے والے تھے۔ اگرچہ قانون کے خلاف آپؐ نے کبھی کسی شخص کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تاہم آپؐ بار بار اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے خود پیش کرتے رہتے تھے کہ جس شخص کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو اس کا بدلہ وہ مجھ سے بے تکلف اور بے خوف و خطر لے۔

ایک مرتبہ قریش کے ایک معزز گھرانے کی ایک عورت نے چوری کی۔ چوری کی سزا اسلام میں ہاتھ کاٹ دینا ہے۔ لوگوں نے جب عورت کے خاندان کی عظمت اور پھر سزا کی نوعیت پر نگاہ کی تو بعض لوگوں پر یہ چیز گراں گزری اور انہوں نے قانون کے استعمال میں اسی فرق مراتب کو ملحوظ رکھنا چاہا جس کے وہ جاہلیت میں عادی تھے۔ چنانچہ اسامہ بن زیدؓ سے، جو آنحضرت کو نہایت محبوب تھے، درخواست کی گئی کہ وہ اس عورت کے بارے میں آپؐ سے سفارش کریں۔ انہوں نے لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی۔ آپؐ ان پر نہایت ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ تم اللہ کے حدود کے معاملہ میں سفارش کرنے آئے ہو! پھر لوگوں کے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں یہ فرمایا کہ تم سے پہلے بہت سی قومیں اس وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا دیتے اور اگر کوئی بااثر آدمی چوری کرتا تو اس سے درگزر کر جاتے، لیکن میں ایسا نہیں کرنے کا۔ خطبہ کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:۔

والذی نفس محمد بیدہٖ	اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان
لو سرقت فاطمۃ بنت محمد	ہے، اگر فاطمہ بنت محمدؐ نے چوری کی ہوتی تو
لقطعت یدھا[1]	اس کا ہاتھ بھی ضرور کاٹ دیتا۔

جبلہ بن ایہم غسانی کا واقعہ ہے کہ اس نے ایک غریب دیہاتی کو تھپڑ مار دیا۔ اسلامی قانون میں اس کے اس تھپڑ کی سزا یہ تھی کہ اس کے بدلہ میں وہ بھی اس غریب دیہاتی کا تھپڑ کھائے لیکن چونکہ وہ ایک والیٔ ریاست تھا اس وجہ سے اس پر یہ چیز بڑی شاق گزری اور اس نے کوشش کی کہ کسی طرح اپنے آپ کو قانون کی زد سے بچالے جائے۔ لیکن جب اسے اندازہ ہو گیا کہ اسلامی قانون کسی قیمت پر بھی شاہ و گدا میں کوئی امتیاز کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تو وہ راتوں رات وہاں سے بھاگ نکلا اور اسلامی حدود سے باہر ہو کر مرتد ہو گیا۔ خلیفۂ اسلام نے ایک حوصلہ مند شہزادے کے مسلمان ہو چکنے کے بعد اس کے فرار اور ارتداد کو گوارا کر لیا لیکن اس امر کو گوارا نہیں کیا کہ ایک غریب اپنی توہین کا بدلہ محض اس وجہ سے نہ لے سکے کہ توہین کرنے والا ایک والیٔ ریاست ہے۔

اس تہذیب و روشنی کے زمانہ میں جبکہ ہر طرف آزادی، مساوات اور اخوت کا نعرہ بلند ہو رہا ہے، اس نعرہ کو عملی صورت دینے کے دعویدار ممالک میں فرانس کو کل تک میر کارواں کی حیثیت حاصل رہی ہے لیکن خود فرانس میں اس نعرہ کی جو عملی شکل ہے وہ یہ ہے کہ ملک میں دو قسم کی عدالتیں قائم ہیں۔ ایک قضائی عدالتیں (Judicial Courts) اور دوسری انتظامی عدالتیں (Administrative Courts)۔ پہلی قسم کی عدالتوں میں عام شہریوں کی آپس کی نزاعات کے فیصلے ہوتے ہیں اور دوسری قسم کی عدالتوں میں وہ مقدمات پیش ہوتے ہیں جن کا تعلق حکومت اور اس کے ملازمین یا پبلک اور حکومت کے مابین معاملات سے ہوتا ہے۔ قریب قریب یہی صورت (تھوڑے سے فروعی رد و بدل کے ساتھ) جمہوریت و مساوات کے اکثر مدعی ممالک میں موجود ہے۔ ایک طرف اپنی کتاب دستور میں اپنے شہریوں کو نہایت حسین و جمیل الفاظ میں قانونی مساوات کی گارنٹی دیتے ہیں اور دوسری طرف اپنے انتظامی قوانین (Administrative Laws) کے ذریعہ سے اس گارنٹی پر خطِ تنسیخ پھیر دیتے ہیں۔ خیانت و بے ایمانی اور ظلم و زیادتی کا جرم اگر ایک عام شہری سے سرزد ہو تو عام قانون کے تحت وہ فوراً پکڑا جائے، حوالات بھیجے اور ملک کے عام عدالتی نظام کے فیصلوں کے تحت جیل کی ہوا کھائے۔ لیکن اگر وہی جرائم اس سے بہت بڑے پیمانہ پر اور اس سے کہیں زیادہ دور رس نتائج کے ساتھ حکومت کی کرسی پر بیٹھنے والے کسی وزیر یا گورنر صاحب سے صادر ہوں تو حکومت کی منظوری کے بغیر ملک کی کسی بڑی سے بڑی عدالت کو بھی حکومت کے اس چہیتے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کا حق نہیں ہے۔ اگر حکومت رائے عامہ سے دب کر یا اپنی کسی مصلحت کے تحت کسی کارروائی کی اجازت دیتی ہے تو بس اس حد تک کہ اس کی اپنی مقرر کردہ خاص عدالت شہادتیں قلمبند کر کے اس کو بھیج دے۔ اس کے بعد یہ حکومت کو اختیار

---

[1] مسلم شریف۔ باب قطع السارق الشریف ..... الخ

ہے کہ وہ اس پر کوئی کارروائی کرے یا نہ کرے۔

عوام اور ارکانِ حکومت کے لئے الگ الگ قانون اور نظامِ عدالت کی موجودگی سے ہوتا یہ ہے کہ حکومت اور ارکانِ حکومت ملک کے قانون اور نظامِ عدالت کی زد سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف عام پبلک گورنمنٹ کے حکام کے مقابل میں قانونی حفاظت سے بہت بڑی حد تک محروم ہو جاتی ہے اور دوسری طرف ارکانِ حکومت کو، عام عدالتوں کی دسترس سے بالاتر ہونے کی وجہ سے، پبلک کے معاملات میں قریب قریب مطلق العنانی کے لیے کھلی چھٹی مل جاتی ہے اور وہ ملک کے عام شہریوں کے معاملات میں اپنے آپ کو اتنی احتیاط برتنے کا پابند بھی نہیں سمجھتے جتنی احتیاط عام ملکی قانون عامی سے عامی شہریوں سے آپس کے معاملات میں ملحوظ رکھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

اسلامی نظام اس قسم کی کسی قانونی اور عدالتی تفریق سے کلیۃً پاک ہے۔ اس کے رسول نے ایک ہی قانون دیا ہے جو سب پر یکساں جاری و نافذ ہوتا ہے، خواہ کوئی شخص منصبِ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہو یا گھاس کی گٹھڑیاں ڈھونے والا ہو۔ اور اس کے اندر ایک ہی نظامِ عدالت ہے جو ہر قسم کی نزاعات کے فیصلے کرتا ہے خواہ وہ امیر المومنین اور ایک غریب ذمی کے درمیان پیدا ہوں یا بازار کے دو معمولی چھابڑی لگانے والوں کے درمیان۔ اس طرح کی انتظامی عدالتوں اور انتظامی قوانین کے لیے جو دلیلیں آج تراشی جاتی ہیں، یہ کوئی نئی دلیلیں نہیں ہیں۔ اسلام کے دورِ اوّل میں بھی یہ دلیلیں بعض لوگوں کے سامنے موجود تھیں اور بعینہٖ انہی مصلحتوں اور حکمتوں کو آڑ بنا کر جو آج اس مساوات کشی کی حمایت میں پیش کی جاتی ہیں، بعض لوگوں نے حضرت عمرؓ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ریاست کے حکام اور رعایا کے مابین پیدا ہونے والی نزاعات کے تصفیہ کے لیے عام قانون اور عام عدالتوں سے علیحدہ انتظام کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر عام قانون کے تحت معمولی عدالتوں کے ذریعہ سے سرکاری حکام کو بھی اسی طرح سزائیں دی گئیں جس طرح معمولی آدمیوں کو دی جایا کرتی ہیں اور کارکنانِ حکومت کی ذمہ داریوں اور ان کی حیثیت کا کچھ لحاظ نہ کیا گیا تو اس سے ان کے اندر بددلی پیدا ہوگی جس سے لازمی طور پر نظم و نسق متاثر ہوگا اور حکومت کی دھاک (PRESTIGE.) کمزور ہوگی لیکن حضرت عمرؓ نے اس دلیل کو تسلیم نہیں کیا۔ جواب میں فرمایا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو عام قانون سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے تو میں دوسروں کو اس سے بالاتر کیسے قرار دے سکتا ہوں؟

عن عمرو بن میمون قال خطب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ الناس فقال انی واللہ ما ابعث الیکم عمالی لیضربوا ابشارکم ولا لیاخذوا من اموالکم ولکنی ابعثہم الیکم لیعلموکم دینکم وسنۃ نبیکم فمن فعل بہٖ ذلک فلیرفعہ الیّ. فوالذی نفسی بیدہٖ لاقصنّہ. فوثب عمرو بن العاص فقال یا امیر المومنین ارأیت ان کان رجل من المسلمین والیا علی رعیتہٖ فادّب بعضہم انک لتقصّنہ منہ؟ فقال ای والذی نفسی بیدہٖ لا قصنہ منہ وقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقص من نفسہ. الا لا تضربوا المسلمین فتذلوہم ...... الخ

(کتاب الخراج ص ۶۶)

عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ لوگوں کے سامنے خطبہ دیا کہ اے لوگو! میں اپنے عاملوں کو تمہارے پاس اس لئے نہیں بھیجتا ہوں کہ وہ تمہیں ماریں پیٹیں یا تمہارے مالوں کو ناجائز طریقہ پر لیں بلکہ میں ان کو اس لیے بھیجتا ہوں کہ وہ تم کو تمہارا دین اور تمہارے نبی کا طریقہ سکھائیں۔ اگر کسی کے ساتھ اس قسم کی کوئی زیادتی کی گئی ہو تو وہ اسے میرے علم میں لائے، اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے، میں اس کو زیادتی کرنے والے سے اس کا قصاص ضرور دلواؤں گا۔ یہ سن کر عمرو بن العاص اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے اے امیر المومنین، فرض کیجئے کہ ایک شخص کہیں کا گورنر ہے اور وہ کسی کو سزا دیتا ہے تو کیا آپ اس سے بھی قصاص دلوائیں گے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں اس سے بھی مظلوم کو قصاص دلواؤں گا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ اپنی ذات کو بھی قصاص کے لئے لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے! خبردار، مسلمانوں (لوگوں) کو مارو پیٹو نہیں کہ ان کو ذلیل کرکے رکھ دو۔

یہ معاملہ حضرت عمرؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کے درمیان اصولی بحث و نظر ہی کی حد تک نہیں رہا بلکہ اسی زمانہ کے بعض حکام کی اس قسم کی زیادتیوں کی رپورٹ ہوئی تو حضرت عمرؓ نے معاملہ کی تحقیق کرکے عمرو بن العاصؓ کی مخالفت اور ان کی سیاسی و انتظامی مصلحت بینیوں کے علی الرغم ان حکام کو بالکل عام قانون کے مطابق سزا کا حکم سنایا اور سرِمو ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی۔

عن عطاء قال كتب عمر رضي الله عنه الى عماله ان يوافوه بالموسم فوافوه فقام، فقال يا ايها الناس! اني بعثت عمالي هؤلاء ولاة بالحق عليكم ولم استعملهم ليصيبوا من ابشاركم ولا من دمائكم ولا من اموالكم فمن كان له مظلمة عند احد منهم فليقم. قال فما قام من الناس يومئذ الا رجل واحد فقال يا امير المؤمنين عاملك ضربني مائة سوط فقال عمر اتضربه مائة سوط؟ قم فاستقد منه فقام عمرو بن العاص فقال له يا امير المؤمنين! انك ان تفتح هذا على عمالك كبر عليهم وكانت سنة يأخذ بها من بعدك. فقال عمر الا اقيد منه

عطاء سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے تمام عمال کو حکم بھیجا کہ حج کے موقعہ پر ان سے ملیں۔ سب نے اس حکم کی تعمیل کی۔ جب سب جمع ہو چکے تو حضرت عمرؓ تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور عمال کی موجودگی میں عام پبلک سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ حضرات! میں نے اپنے ان عاملوں کو حق و انصاف کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے کے لئے آپ لوگوں پر مقرر کیا ہے، ان کو اس لئے نہیں مقرر کیا ہے کہ یہ آپ کے جسموں، آپکی جانوں اور آپکے مالوں پر دست درازیاں کریں۔ اگر آپ میں سے کسی شخص کو ان میں سے کسی قسم کی زیادتی کی شکایت ہو تو وہ اٹھے اور بیان کرے۔ راوی کا بیان ہے کہ اتنے بڑے مجمع میں سے اس دن صرف ایک شخص اٹھا؎ اور اس نے شکایت کی کہ امیر المومنین، آپ کے عامل نے مجھے سو کوڑے مارے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس سے دریافت فرمایا کیا تم بھی اس کو سو کوڑے مارنا چاہتے ہو؟ اگر چاہتے ہو تو اٹھو، اس سے اپنا بدلہ لے لو۔ یہ سن کر عمرو بن العاصؓ سامنے آئے اور بولے کہ اے امیر المومنین! اگر آپ نے اپنے افسروں

؎ اللہ اکبر! اس دنیا نے کبھی عدل و انصاف کا یہ دورِ سعادت بھی دیکھا ہے جب فاروق اعظمؓ کی اتنی وسیع سلطنت کے اندر صرف ایک شخص ان کے ایک عامل کے خلاف شکایت کے لئے اٹھتا ہے۔ مگر اس امر کا پورا اطمینان ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا افسر بھی شکایت کرنے والے کا بال بیکا نہیں کر سکتا!

وقد رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقيد من نفسه ثم قال فاستقد. فقال عمرو دعنا اذن فلنرضه؟ قال فقال دونكم. قال فارضوه بان اشتريت منه بمائتي دينار كل سوط بدينارين.

(کتاب الخراج صفحہ ۶۶)

کے خلاف ان پر یہ راہ کھول دی تو ان پر یہ چیز بہت گراں گزرے گی اور یہ ایک سنت بن جائے گی جس پر آپ کے بعد والے بھی چلیں گے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا میں اس سے اس کا قصاص نہ دلواؤں حالانکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپؐ اپنی ذات کو قصاص کے لیے پیش فرماتے تھے! (مدعی سے مخاطب ہو کر) اٹھو اور اپنا بدلہ لے۔ عمرو بن العاصؓ بولے اچھا تو آپ ہمیں اس بات کی اجازت دیجئے کہ ہم مدعی کو جس طرح چاہے راضی کر لیں۔ فرمایا۔ ہاں اس کا تم کو اختیار ہے۔ چنانچہ مدعی کو دو سو دینار دے کر راضی کیا گیا۔

خلافتِ راشدہ کے دور میں اس کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ خود خلفائے راشدینؓ مدعا علیہ کی حیثیت سے عام عدالتوں میں حاضر ہوئے ہیں اور اپنے اوپر لگائے ہوئے الزام کی ایک معمولی شہری کے مقابل میں جواب دہی کی ہے۔ لیکن ان واقعات کی تفصیل کے لیے یہ مقام موزوں نہیں ہے۔ البتہ ایک واقعہ کا ذکر ہم صرف اس لئے کرتے ہیں کہ اندازہ ہو سکے کہ تاریخ کے اس دور میں جبکہ دنیا قانونی مساوات کے لفظ سے بھی ابھی آشنا نہیں ہوئی تھی، اسلام کی تعلیم کی برکت نے قانونی اور عدالتی مساوات کے بارے میں مسلمانوں کے احساسات کو کس قدر نازک اور تیز بنا دیا تھا: حضرت علیؓ اور کسی ذمی کے درمیان نزاع تھی۔ معاملہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش ہوا۔ جب فریقین عدالت میں پیش ہوئے تو جج (حضرت عمرؓ) نے کسی وجہ سے حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ابو تراب (حضرت علی کی کنیت) آپ اپنے فریق کے برابر بیٹھئے۔ حضرت عمرؓ کے اس فقرے کو حضرت علیؓ نے کچھ ایسا محسوس کیا جس سے حضرت عمرؓ کو گمان ہوا کہ شاید ان کو ان کی یہ ہدایت بری لگی ہے۔ بولے، ابو تراب، شاید آپ کو میری یہ ہدایت ناگوار گزری حالانکہ اسلام کی قانونی اور عدالتی مساوات کا تقاضا یہی ہے کہ آپ اپنے فریق کے برابر بیٹھیں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا

؎ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ بھی عامل کے ساتھ کوئی رعایت نہیں تھی بلکہ اسلامی قانون فوجداری میں یہ معاملہ ہے ہی قابل راضی نامہ۔

کہ مجھے یہ چیز بُری نہیں لگی ہے کہ آپ نے مجھے میرے فریق کے برابر بیٹھنے کی ہدایت فرمائی مجھے جو چیز ناگوار گزری وہ یہ ہے کہ آپ نے مجھے کنیت کے ساتھ خطاب فرمایا اور اس طرح سے میرے فریق کے مقابل میں میری عزت افزائی فرمائی۔ یہ میرے فریق کے ساتھ ناانصافی ہے؎۔

۴۔ معاشرتی مساوات اسلامی ریاست اپنے شہریوں کے درمیان شریف اور رذیل کا کوئی فرق تسلیم نہیں کرے گی۔ خون، نسب، رنگ اور پیشہ وغیرہ کی بنا پر جو فرق قائم کرلئے گئے ہیں اسلامی نقطۂ نظر سے سب باطل ہیں۔ اسلام میں شرافت اور رذالت کی کسوٹی صرف دین و تقویٰ ہے اور اس کسوٹی پر لوگوں کو جانچنا اور ان کے شریف و رذیل کے درمیان امتیاز کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے کیونکہ غیب کا علم صرف اسی کو ہے۔ ریاست ان باطنی امور میں دخل دینے کی مجاز نہیں ہے۔ اس کی تمام پالیسی ظاہر حالات پر مبنی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنے ہر شہری کو جو شہریت کی شرائط پوری کرتا ہے، معاشرتی رتبہ کے لحاظ سے ایک ہی درجہ میں رکھتی ہے اور اسی حیثیت سے اس کے ساتھ معاملہ کرتی ہے۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرما دیا ہے :۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى	اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے
وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا	اور تم کو مختلف شاخوں اور قبیلوں میں اس لئے تقسیم کر دیا ہے
إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ	کہ تم میں آپس میں شناخت ہو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت
عَلِيمٌ خَبِيرٌ۔ (۱۳ الحجرات)	والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مساوات کو اس طرح واضح فرمایا ہے کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں مگر دین اور تقویٰ کے ذریعہ سے۔ سب آدم ہی کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے ایک سپہ سالار کو ضروری ہدایات دیتے ہوئے اس اصول کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی:

لیس بین اللہ و بین احد نسب	اللہ اور کسی شخص کے درمیان کوئی رشتہ نہیں
الا بطاعته فالناس شریفهم	ہے مگر اس کی اطاعت کے واسطے سے۔ یہی
و وضیعهم فی دین اللہ سواء	وجہ ہے خدا کے قانون میں شریف اور حقیر
(الفاروق عمر محمد حسین ہیکل صفحہ ۱۵۱)	سب برابر ہیں۔

؎ عرب کے آداب معاشرت میں کسی شخص کو اس کے نام کے بجائے اس کی کنیت سے مخاطب کرنا اس کے احترام کی دلیل تھی۔ حضرت علیؓ کو یہ چیز ناگوار گزری اور وہ یہ سمجھے کہ ان کو تو کنیت (ابوتراب) کے ساتھ مخاطب کیا گیا اور ان کے فریق کو اس کے معمولی نام سے، حالانکہ اسلام کی عدالتی مساوات کا تقاضا یہ تھا کہ ان کو اور ان کے فریق کو بالکل ایک سطح پر رکھا جاتا۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

اسلامی تعلیم

پاکستان کی وحدت اور سالمیت کی ضروری شرط :

ملک کے اندر اس وقت افتراق اور انتشار کی جو کیفیت موجود ہے اس کا باعث یہ ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد فوراً ہی یہاں ایسے حالات پیدا ہوئے اور اب تک قائم رہے ہیں جن کی وجہ سے ہم متواتر اسلام سے دور ہوتے رہے ہیں اور ملک کے اندر بتدریج ایک نظریاتی خلا پیدا ہوتا رہا ہے جو ساتھ ہی ساتھ لسانی کلچرلزم، صوبائی نیشنلزم، کمیونزم اور غیر اسلامی ازموں سے پُر ہوتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب یہ ازم اس ملک کی وحدت، آزادی اور سالمیت کے لئے ایک خطرہ بن گئے ہیں۔

جب سے پاکستان بنا ہے ہماری تمنا یہ رہی ہے کہ پاکستان کے تمام ثقافتی، نسلی اور لسانی منطقوں میں مکمل اتحاد موجود رہے۔ لیکن اس اتحاد کو قائم کرنے کے لئے اب تک ہم نے جتنی کوششیں کی ہیں چونکہ وہ خدا کے ان قوانین قدرت کے علم پر مبنی نہیں تھیں جن کے ماتحت منظم انسانی جماعتوں یا ریاستوں کا اندرونی اتفاق یا افتراق ظہور پذیر ہوتا ہے لہٰذا وہ سب ناکام رہی ہیں۔ بلکہ حالات سے ظاہر ہے کہ ان کا نتیجہ برعکس ہی ہوا ہے۔ افسوس کہ ہم نے اس بات کو نہ سمجھا کہ اس دنیا میں کوئی چیز بے قاعدہ نہیں ہوتی بلکہ ہر واقعہ خدا کے ایسے قوانین کے ماتحت سرزد ہوتا ہے جو غیر مبدل اور بے پناہ ہیں۔ اگر ہم کسی مقصد کو حاصل کرنا چاہیں تو ہمارے سامنے صرف یہی ایک راستہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے عمل کو خدا کے ان قوانین کے مطابق بنائیں جو اس مقصد کے حصول کی طرف لے جانے والے ہوں۔ اگر ہم ایسا نہ کر سکیں تو خدا کے یہی قوانین ہمارے خلاف کام کرتے ہیں اور ہمارے مقصد کو ناکام کر دیتے ہیں اور یہ کلیہ ہر حالت میں درست رہتا ہے خواہ ہمارا مقصد مادی دنیا کے اندر کسی چیز سے تعلق رکھتا ہو مثلاً ایک پل یا ریلوے لائن تعمیر کرانا یا حیاتیاتی دنیا کے اندر کسی تبدیلی سے متعلق ہو مثلاً عمدہ گھوڑوں کی ایک نئی نسل یا گندم یا مکئی کی ایک نئی قسم تیار کرنا یا ہم نفسیاتی اور انسانی دنیا کے اندر کوئی تغیر چاہتے ہوں مثلاً ایک قوم کے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کرنا

اور یہی تغیر ہے جو ہم اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ یہ تغیر انسانی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اسے پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے عمل کو خدا کے ان قوانین کے مطابق بنائیں جو قوموں کے اتفاق اور اتحاد کے ظہور پر حکمران ہیں۔

انسان کی پوری تاریخ کے حقائق سے یہ بات آشکار ہے کہ نصب العین کی محبت ہی دنیا میں ایک قوت ہے جو افراد کو متحد کرکے ایک قوم بناتی ہے۔ ان کو جماعتی عمل اور جدوجہد پر اکساتی ہے اور ان کو منظم کرکے ایک ریاست کی شکل میں لاتی ہے۔ جب نصب العین کو انسان کی قدرتی عملی زندگی کے مختلف شعبوں پر چسپاں کیا جاتا ہے تو وہی ایک نظریہ بن جاتا ہے۔ نصب العین کے بغیر نہ کوئی ریاست وجود میں آسکتی اور نہ ہی وجود میں آنے کے بعد کوئی کام کر سکتی یا قائم رہ سکتی ہے۔ ایک ہی نصب العین کو چاہنے والے افراد ایک مشترک نصب العین سے محبت رکھنے کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ بھی محبت رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ مل کر ایک منظم جماعت یا ریاست بن جائیں تاکہ اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے زور دار جدوجہد کر سکیں۔

ہر فرد انسانی اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ وہ کسی نہ کسی نصب العین سے محبت کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اگر وہ ایک نصب العین سے محبت نہ کر سکے تو اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ فی الفور کسی دوسرے نصب العین سے محبت کرے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو مختلف قسم کی ذہنی اور قلبی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نصب العین کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ موافق قسم کے تعلیمی اثرات سے اس کی محبت نشو و نما پا کر اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے اور ناموافق قسم کے تعلیمی اثرات سے اس کی محبت کمزور اور مضمحل ہو کر مٹ جاتی ہے اور پھر ایک اور ہی نصب العین کی محبت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

خدا نے ہر فرد انسانی کے دل میں نصب العین کی محبت کی ایک خاص استعداد رکھی ہے۔ اگر اس کی تعلیم و تربیت اس طرح سے ہو کہ اس کا نصب العین اس کی محبت کی ساری فطری استعداد کو کام میں لے آئے۔ تو نصب العین کی محبت اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اگر بدقسمتی سے اس کی تعلیم و تربیت اس طرح سے نہ ہو اور اس کا اپنا نصب العین اس کی ساری فطری استعداد محبت کو کام میں نہ لا سکے اور اس کی محبت درجہ کمال پر نہ پہنچ سکے بلکہ کمزور اور مضمحل رہے تو پھر چونکہ فرد کی فطری استعداد محبت کا کوئی حصہ غیر مصروف نہیں رہ سکتا۔ وہ فرد دوسرے نصب العینوں کے تعلیمی اثرات کی زد میں آنے اور ان کی محبت کا شکار بننے کے لئے مہیا ہو جاتا ہے اور اگر وہ درحقیقت کسی اور نصب العین کے تعلیمی اثرات کے زد میں آجائے تو وہ نصب العین اس کی فطری استعداد محبت کے ایک حصہ کو اپنے تصرف میں لے آتا ہے۔ اس صورت میں اس کے پہلے نصب العین کی محبت اور کمزور ہو جاتی ہے۔ اور کسی نئے نصب العین کی محبت اسی نسبت سے طاقتور ہو جاتی ہے۔ اس خطرناک حالت میں اگر مخالف نصب العین کے تعلیمی اثرات کو ختم کرکے اور اصل نصب العین کے تعلیمی اثرات کو پوری طرح سے طاقتور بنا کر اس عمل کا فوری سدباب نہ کیا جائے تو

پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد فرد اپنے اصل نصب العین کو کلیتہً چھوڑ دیتا ہے اور اس کی بجائے اس دوسرے نصب العین کو اختیار کر لیتا ہے اسی حالت میں وہ اپنے پہلے نصب العین کے چاہنے والے کی حیثیت سے گویا موت کے منہ میں چلا جاتا ہے اور نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی ریاست کے افراد کے دلوں میں ان کے اصل نصب العین کی محبت کمزور ہوگی تو پھر ایک نصب العین نہیں بلکہ بہت سے نصب العین اپنے تعلیمی اثرات کو لے کر اس کی جگہ لینے کے لئے سامنے آجائیں گے اور ریاست کے لوگوں کا نصب العین ایک نہیں رہے گا بلکہ ان کے نصب العین بہت سے ہو جائیں گے اور ریاست ٹکڑوں میں بٹ جائے گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ریاست جو کسی خاص دن اپنی آزادی حاصل کرکے وجود میں آئے ایک مضبوط اور ترقی پذیر وحدت کے طور پر زندہ رہنا چاہتی ہو اور یہ نہ چاہتی ہو کہ وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جائے جن میں سے ہر ایک کا نصب العین دوسروں سے مختلف ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی دن ایک ایسا نظام تعلیم قائم کرے جو اس کے افراد کے مشترک نصب العین کی محبت کو نہ صرف اس درجہ پر قائم رکھ سکے جو اس کو وجود میں لایا تھا بلکہ اسے ترقی دے کر کمال پر پہنچا سکے تاکہ کسی اور نصب العین کے اثر و نفوذ کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ ریاست کے اس فرض کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ تمام مخالف یا دشمن نصب العینوں کے تعلیمی اثرات کا پوری طرح سے سدباب کرے خواہ وہ ملک کے اندر سے نمودار ہوں یا باہر سے آئیں۔ اس قسم کے تعلیمی اثرات ملکی اور غیر ملکی مدرسوں اور کالجوں کی درسی کتابوں اور استادوں اور پروفیسروں کی تقریروں کی راہ سے ہی نہیں آتے بلکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن اور اخباروں، رسالوں، کتابوں اور کوتاہ نظر نیم حکیم بلکہ زہر فروش قسم کے لیڈروں اور دانشوروں کی تقریروں، گفتگوؤں اور اخباری بیانوں، غیر ملکی مشنریوں کے دواخانوں اور ہسپتالوں۔ دودھ کے ڈبوں، اس کے جریدوں، دیہاتی ترقی اور خوشحالی کے کاموں اور دشمن فرقوں اور قوموں کی سیاسی سازشوں اور غیر ملکی نام نہاد مفکروں اور شخصیتوں کے مشوروں، غیر ملکی متحرک اور غیر متحرک کتب خانوں اور اطلاعاتی مرکزوں کی راہ سے بھی آتے ہیں۔ جس طرح سے بعض غذائیں زہریلی ہوتی ہیں اور ان سے جسم کی موت واقع ہو جاتی ہے اسی طرح سے بعض آراء و افکار اور خیالات اور تصورات بھی زہریلے ہوتے ہیں اور ان سے روح کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اگر ریاست اپنے اس فرض سے غافل ہو جائے تو ناممکن ہے کہ وہ دیر تک زندہ رہ سکے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ مخالف قسم کے تعلیمی اثرات سے قوم کو بچانا تو درکنار صحیح نظام تعلیم قائم نہ کر سکنے کی وجہ سے پھر وہ لازماً ایک غلط نظام تعلیم قائم کرے گی جو نہ صرف قوم کے صحیح نصب العین کی محبت کی نشو و نما کو روک دے گا بلکہ غلط نصب العینوں کی محبت کی نشو و نما کرے گا یا کم از کم ان کی محبت کی نشو و نما کے رستے کھلا چھوڑ کر ہولناک نتائج بہم پہنچائے گا۔ ایسی ریاست کی مثال اس غلام کی طرح ہوگی جو اپنے ظالم آقا سے بھاگنے میں کامیاب ہو جائے لیکن جنگلی جانوروں اور دشمنوں سے بے پرواہ ہو کر ایک خطرناک جنگل میں جا کر سو جائے۔

ہر منظم انسانی جماعت یا ریاست ایک زندہ جسم حیوانی . . . . . کی طرح ہوتی ہے اور اس کا کردار ایسے نفسیاتی قوانین کے مطابق سرزد ہوتا ہے جو حیاتیاتی قوانین سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی ایک ہی ہے اور اس کی خصوصیات ایک ہی رہتی ہیں خواہ وہ اپنا اظہار حیوانی سطح پر کر رہی ہو یا انسانی سطح پر۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک زندہ جسم حیوانی بھی ایک فرد واحد نہیں ہوتا بلکہ کروڑوں افراد کی ایک منظم جماعت یا ریاست ہوتا ہے جن کو ہم خلیات کہتے ہیں اور جو سب مل کر اس ریاست کی زندگی اور نشو و نما کو برقرار رکھنے کے لئے کام کرتے ہیں۔ جس طرح سے ایک زندہ جسم حیوانی کی قوت حیات کروڑوں خلیات کو متحد اور منظم کر کے ایک جسد واحد بنا دیتی ہے اسی طرح سے نصب العین کی محبت کی بے پناہ قوت کروڑوں انسانی افراد کو متحد اور منظم کر کے ایک ریاست بنا دیتی ہے۔ ایک جسم حیوانی کے خلیات جس قدر زیادہ قوت حیات سے معمور ہوتے ہیں اسی قدر زیادہ ان میں تعاون اور اتحاد ہوتا ہے اور اسی قدر زیادہ جسم صحت مند ہوتا ہے اور نشو و نما پاتا ہے۔ اسی طرح سے ایک ریاست کے افراد جس قدر زیادہ اپنے نصب العین سے محبت رکھتے ہوں اسی قدر زیادہ ریاست بھی متحد اور منظم اور ترقی پذیر اور خوش حال ہوتی ہے کیونکہ اسی قدر زیادہ اس کے افراد جذبۂ عمل سے سرشار ہوتے ہیں اور ان کا کردار حرص و ہوا سے مامون و محفوظ اور تنگ نظرانہ اختلافوں اور بے ہمدردیوں اور خود غرضیوں اور جنبہ داریوں سے بالا ہوتا ہے۔ جب ریاست کے افراد کے دلوں میں نصب العین کی محبت اپنے پورے کمال پر پہنچ جاتی ہے تو ریاست اور اس کے افراد کے یہ زریں اوصاف بھی اپنے کمال پر پہنچ جاتے ہیں۔

جس طرح سے انسان کے جسم کو پوری طرح سے نشو و نما پانے تندرست رہنے اور عمر دراز پانے کے لئے ایسی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے جو پروٹین، حیاتین اور نمکیات سے بھرپور ہو اسی طرح سے ایک ریاست کو توانا رہنے، ترقی کرنے اور دنیا کے نقشہ پر ہمیشہ کے لئے موجود رہنے کے لئے ایسے نصب العین کی ضرورت ہوتی ہے جو حسن خیر اور صداقت کے اوصاف سے بدرجہ کمال بہرہ ور ہو۔ جس طرح سے جاندار کے جسم کے اندر ایسے اعضائے رئیسہ ہوتے ہیں جو جسم کی غذا کو ہضم اور جذب کر کے جسم کے خلیات کے ذریعہ سے جسم کے کونے کونے میں پہنچانے کا کام کرتے ہیں اسی طرح سے ایک زندہ ریاست کے اندر بھی نظام تعلیم ادبی اور تعلیمی اور تبلیغی اداروں کی صورت میں ایسے مراکز ہوتے ہیں جو ریاست کے افراد کے ذریعہ سے نصب العین کی محبت کی نشو و نما کرنے والے افکار و تصورات کو ریاست ۔۔ ۔۔ ۔۔ کے کونے کونے میں پہنچاتے ہیں۔ اگر وہ خوراک جو ایک جاندار کو میسر آ رہی ہو ضروری عناصر سے عاری ہو تو پھر جاندار کے جسم کی قوت حیات کمزور ہو جاتی ہے اور جاندار بیمار ہو کر قریب المرگ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی ریاست کا نصب العین حسن، صداقت اور خیر کے اوصاف سے بدرجہ کمال بہرہ ور نہ ہو تو ریاست زود یا بدیر کمزور ہو کر صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ نزاع کے وہ قوانین جو کسی ریاست کے اندرونی اتحاد یا افتراق اور ملک کے طبقہ

اوصاف یا امراض کو پیدا کرنے کے لئے عمل کرتے ہیں حسب ذیل ہیں :-

۱ : ہر ریاست بہت سے افراد کی اس خواہش کے نتیجہ کے طور پر جنم لیتی ہے کہ وہ ایک ایسے نصب العین کے تقاضوں کو عملی زندگی میں پورا کرنے کے لئے مل کر جد و جہد کریں جسے وہ دل و جان سے چاہتے ہیں۔

۲ : اگر دوسرے حالات یکساں ہوں تو ایک ریاست کے افراد جس قدر زیادہ اپنے نصب العین سے محبت رکھتے ہوں اسی قدر زیادہ وہ ریاست متحد اور منظم اور طاقتور اور ترقی پذیر اور خوشحال ہوتی ہے۔

۳ : ایک ریاست کا نظام تعلیم جس میں تعلیم کے تمام ذرائع پر اس کا تسلط شامل ہے اس کے ہاتھ میں ایک ایسا آلہ کار ہوتا ہے جس کے صحیح یا غلط استعمال سے وہ ریاست کے افراد کے دلوں میں ان کے نصب العین کی محبت کو زیادہ یا کم کر سکتی ہے، کمال پر پہنچا سکتی ہے یا بالکل نیست و نابود کر سکتی ہے۔

۴ : وہ ریاست جو اپنے افراد کو ایسی تعلیم نہیں دیتی جس سے وہ اس نصب العین کو جو اسے وجود میں لانے کا باعث ہوا تھا دل و جان سے محبت کرنے لگیں ضروری ہے کہ وہ زود یا بدیر مٹ کر رہے۔

۵ : ضروری ہے کہ ایک ریاست کا نصب العین بدرجہ کمال حسن نیکی اور صداقت کے اوصاف کا مالک ہو تاکہ ریاست ارتقاء کی ان قوتوں کے سامنے ٹھہر سکے بلکہ ان قوتوں کی حمایت اور حفاظت میں پناہ لے سکے۔ جو ناقص نصب العینوں پر قائم ہونے والی تمام ریاستوں کو توڑ پھوڑ کر مٹانے اور کامل نصب العین پر قائم ہونے والی ریاست کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کے لئے کار فرما ہیں۔

اس بات پر اختلاف ہو سکتا ہے کہ قائداعظم کے ساتھیوں میں سے کون پاکستان کے مقصد کے متعلق مخلص تھا اور کون نہیں۔ لیکن جو نعرہ مسلمانوں کو شہادت پانے کے لئے گھروں سے باہر لایا تھا وہ یہی تھا پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ۔ لہٰذا جس نصب العین کے لئے مسلمانوں نے جان و مال اور نام و ناموس کی بے شمار قربانیاں دی تھیں اور جس نصب العین نے ہزارہا مسلمانوں کو متحد اور منظم کر کے پاکستانی ریاست کی شکل دی تھی وہ خدا کا عقیدہ تھا جو اسلام کی روح ہے اور جس پر اسلام کے تمام فرقے متفق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں نے مل کر کسی اختلاف کے بغیر پاکستان کے لئے وہ جد و جہد کی تھی جس کے نتیجہ کے طور پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو جو رمضان کے مقدس مہینہ کی مقدس ستائیسویں رات بھی تھی، پاکستان کا مقدس ملک وجود میں آیا تھا۔ لہٰذا پاکستان کی سلامتی اور بقا کے لئے ضروری تھا کہ اسی دن سے ہم یونیورسٹیوں کے ایک ایسے نظام تعلیم کی تشکیل کے کام میں لگ جاتے، جو پاکستان کے نصب العین یعنی لا الٰہ الا اللہ یا خدا کی محبت کو نہ صرف اس درجہ پر قائم رکھتا جو پاکستان کو وجود میں لانے کا سبب ہوا تھا بلکہ اسے اور ترقی دے کر نقطۂ کمال پر پہنچاتا اور وہاں موجود رکھتا تاکہ پاکستان بنانے والی قوم پھر کسی دوسرے نصب العین کی طرف مائل نہ ہو سکتی اور اس کے ساتھ ہی ہم ملک کے اندر یا باہر کے دشمنوں اور

عقیدوں سے پیدا ہونے والے ایسے تعلیمی اثرات کا پوری قوت اور جرأت سے سدباب کرتے جو کسی درجہ میں بھی پاکستان کے نصب العین کے تقاضوں کے منافی ہوتے۔ جہاں تک یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم کی نئی تشکیل کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ اگر ہم اسے پاکستان کے نصب العین کے مطابق بنانے کی کوششیں کرتے تو ہم یہ محسوس کرتے کہ یہ ضروری ہے کہ اس میں خدا کا اسلامی عقیدہ، تمام سائنسی علوم یعنی طبیعیاتی، حیاتیاتی اور انسانی علوم کی درسی کتابوں کے موضوعات کا مرکزی اور محوری تصور ہو اور پھر ہم ان علوم کی درسی کتابوں کو اس زاویہ نگاہ سے از سر نو تیار کرتے۔ لیکن افسوس کہ ہم نے بیس سال ضائع کر دیئے اور ایسا نہ کیا۔ اس کے برعکس ہم نے پاکستان میں وہی بے خدا نظام تعلیم رائج کیا اور قائم رکھا جو انگریز نے اپنے نصب العین کی ضروریات کے ماتحت نافذ کیا تھا۔ یہ نظام تعلیم بیس سال سے ہمارے دلوں میں خدا کی محبت کے اس جوش و خروش کو ٹھنڈا کرتا رہا ہے جس کی وجہ سے پاکستان بنا تھا اور اس کے عوض میں ہمارے دلوں کو اندرونی اور بیرونی غلط آدرشوں کی محبت سے گرماتا رہا ہے۔ ناممکن تھا کہ ہم اس نظام تعلیم کے خطرناک اثرات کو نصاب تعلیم کے اندر اسلامیات کے ایک مضمون کا اضافہ کر کے روک سکتے۔ اس مضمون کے اضافہ سے الٹا نتیجہ یہ ہوا کہ طلبہ کے دل میں یہ بات اور راسخ ہو گئی کہ خدا کا عقیدہ کائنات کے علوم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ جبھی تو خدا کا عقیدہ صرف ایک مضمون میں ہے اور باقی مضامین اس سے خالی ہیں۔

ان حالات میں کوئی تعجب نہیں کہ خدا کے وہ قوانین جو منظم انسانی جماعتوں یا ریاستوں کے اندرونی اتحاد و افتراق کو پیدا کرنے کے لئے کارخانہ قدرت میں کارفرما ہیں۔ ان بیس سالوں میں ہمارے خلاف کام کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آج ان آدرشوں کے چاہنے والے پاکستان کے نصب العین کے خلاف میدان میں اتر رہے ہیں اور ملک کے کئی ٹکڑوں میں بٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ خدا کے ان قوانین کا فیصلہ یہ ہے کہ اس صورت حال کا شافی اور کافی علاج سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ نظام تعلیم کو پاکستان کے نصب العین کے مطابق نہ بنانے کی جو غلطی پاکستان کے ظہور سے ان کی گئی تھی اس کا ازالہ کیا جائے اور خدا کے تصور پر مبنی نظام تعلیم وجود میں لایا جائے۔ جو قوم نظریاتی محاذ پر اپنی حفاظت نہیں کرتی وہ فوجی محاذ پر بھی اپنی حفاظت نہیں کر سکتی خواہ وہ میزائلوں اور ایٹم بموں کے انبار لگا دے لہٰذا تعلیم ایک ریاست کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ وہ ڈیفنس کا ایک حصہ ہے اور اسے ڈیفنس کے ساتھ ہی مرکز میں رہنا چاہیئے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارا نصب العین یعنی خدا کا عقیدہ ہر نقص سے پاک اور ہر کمال سے آراستہ ہے۔ کیونکہ اس میں حسن خیر اور صداقت کی صفات بدرجہ کمال موجود ہیں۔ خدا سے بلند تر نصب العین تصور میں نہیں آ سکتا۔ یہ نصب العین وہ مکمل روحانی غذا ہے جس میں خودی یا روح کی اشتہائے حسن کو مطمئن کرنے اور خودی کی پرورش کرنے کے لئے صفات حسن کی صورت میں تمام ضروری اجزاء و عناصر موجود ہیں۔ لہٰذا اگر ہم اس نصب العین سے محبت کرنے

کے لئے اپنے آپ کو مناسب تعلیم و تربیت سے مستفید کرتے رہیں تو اس سے کبھی ہٹ نہیں سکتے اور نہ اس کو ترک کر سکتے ہیں اور لہٰذا ایسی حالت میں ایک قوم کی حیثیت سے کبھی مٹ نہیں سکتے۔ یہ نصب العین کائنات کے جذبہ کمال کا مقصود اور مطلوب ہے۔ یہ نصب العین بیک وقت حرکت ارتقا کا راستہ بھی ہے اور منزل بھی، عمل تاریخ کا ذریعہ بھی ہے اور اس کا حاصل بھی۔ لہٰذا اس نصب العین کے عشاق اس تباہی سے محفوظ رکھے جاتے ہیں جو غلط نصب العینوں کے چاہنے والوں کے لئے مقدر کی گئی ہے۔ ارتقائے عالم کی وہی قوتیں جو تمام غلط نصب العینوں کو مٹانے کے لئے کارفرما ہیں وہی قوتیں اس نصب العین کو دنیا بھر میں ان کی جگہ دلانے کے لئے مصروف عمل ہیں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم احساس کمتری کا شکار ہوں کہ تعلیم کے بارہ میں مٹ جانے والی بے بصیرت قوموں کی پیروی کریں اور خدا کے عقیدہ کو تمام علوم کے محوری تصور کی حیثیت سے تعلیم میں نہ لائیں۔ افسوس ہے کہ وہ قوم جو اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ پوری نوع انسانی کو خدا کے عقیدہ پر متحد کر کے امن اور عافیت کی نعمتوں سے ہمکنار کرے۔ وہی قوم اس عقیدہ کی بنا پر اپنے اتحاد کا سامان کرنے سے گریز کر رہی ہے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ وہ دوسروں کی نقل کو ہر حالت میں مطابق اصل کے رکھنا چاہتی ہے اور اس میں کوئی فرق پیدا کرنا نہیں چاہتی۔ اگر ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں خدا کے ان بے پناہ اور غیر مبدّل قوانین کی آواز کو سننا چاہیئے جن کا ذکر اس سے پہلے کیا گیا ہے اور خدا کے عقیدہ کو اپنی تعلیم کے اندر سائنسی علوم کا مرکزی اور محوری تصور بنانا چاہیئے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو یہ کوئی نئی بات نہ ہو گی۔ بلکہ فقط اپنے آباء و اجداد کی دانشمندی کا اعادہ ہو گا۔ یہ بات اب مسلم ہے کہ دنیا کے سب سے پہلے سائنس دان جنہوں نے سائنسی طریق تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی اسپین کے مسلمان تھے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ مظاہر قدرت خدا کی نشانیاں ہیں ان کا مشاہدہ اور مطالعہ کرو تاکہ تم خدا کو پہچان سکو۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا عقیدہ مسلمانوں کی سائنس کا مرکزی تصور تھا۔ لیکن جب مسلمان اسپین سے رخصت ہو گئے اور سائنس ان کے عیسائی شاگردوں کے ہاتھ آئی تو چونکہ قرآن حکیم کی تعلیمات کے بالکل برعکس جدید عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ دین اور دنیا کا آپس میں کوئی تعلق نہیں اور یہ سمجھ لیا گیا کہ سائنس فقط اس دنیا سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا انہوں نے خدا کے پاک تصور کو بزعم خود ناپاک سائنس سے الگ کر دیا۔ لیکن اب مغرب کے مفکرین اپنی غلطی کا احساس کر کے قرآن حکیم کی اس تعلیم کی طرف واپس لوٹ رہے ہیں کہ مظاہر قدرت خدا کی ہستی اور صفات کے نشانات ہیں اور ان کا مشاہدہ اور مطالعہ اسی حیثیت سے کرنا چاہیئے کیونکہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ اس غلطی نے ان کی تہذیب کو جاں بلب کر دیا ہے۔ دنیا کا ایک ممتاز سائنس دان ڈاکٹر آرتھر وارڈ ملک اپنی کتاب "خلقیات" میں لکھتا ہے:

> "جوں جوں انسان سائنس کے کرشموں سے واقفیت حاصل کرتا جاتا ہے اور اپنے گرد و پیش کی کائنات کے متعلق اس کا علم بڑھتا جاتا ہے اسی نسبت سے وہ مذہب کے اور قریب آ جاتا ہے اور اپنے پہلے

کرنے والے کا زیادہ احترام کرتا ہے۔ کوپرنیکس کے زمانہ سے آج تک سائنس نے جتنی ترقی کی ہے وہ یقیناً اہلِ دنیا کے لئے خدا کو پہچاننے اور پانے کا سب سے بڑا اور منظم ذریعہ ہے۔"

لیکن جب تک خدا کا عقیدہ سائنس کے کتاب کے اندر داخل ہو کر اور سائنس کے ساتھ جڑ کر سائنسی حقائق کی راہ نمائی اور تنظیم نہ کرے، سائنس سے خدا کو جاننے اور پہچاننے کا کام نہیں لیا جا سکتا یہی سبب ہے کہ دیباق امریکہ کی تاریخ کی مصنفین ولسن (WILSON) اور برونر (BRUNER) لکھتے ہیں:-

"اگر سائنسی علم بعض ایسے فلسفیانہ اور مذہبی عقائد کے زیرِ ہدایت و تسلط مدون کیا جائے، جو زندگی کی بنیادی قدروں اور غرضوں کے حامل ہوں تو ہمارے خیال میں یہ بات نوعِ انسانی کے لئے بہت بڑی برکت کا باعث ہوگی۔"

فیلڈ مارشل سمٹس (F.M.SMUTS) جس نے ہولزم (HOLISM) کے عنوان سے فلسفہ کی ایک نہایت ہی اونچی اور عمدہ کتاب لکھی ہے کہتا ہے:-

"صداقت کی مخلصانہ جستجو اور نظم اور حسن کا ذوق رکھنے کی وجہ سے سائنس، مذہب اور فن کی بعض خصوصیات سے حصہ لیتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ کہنا بہت حد تک قرینِ انصاف ہوگا کہ سائنس ہمارے اس زمانہ کے لوگوں کے لئے شاید خدا کی ہستی کا سب سے بڑا انکشاف ہے۔ یقیناً آگے چل کر نوعِ انسانی کے لئے کرنے کے بڑے بڑے کاموں میں ایک یہ ہوگا کہ وہ سائنس کو اخلاقی قدروں کے ساتھ جوڑے اور اس طرح اس مہیب خطرہ کا سدِّباب کرے جو ہماری تہذیب کے مستقبل کو درپیش ہے۔"

مغربی مفکرین کی تحریروں سے اس قسم کے بے شمار حوالے نقل کئے جا سکتے ہیں جن میں وہ سائنس کو مذہب کے ساتھ جوڑنے پر زور دیتے ہیں لیکن بے خدا سائنس کے تباہ کن اثرات کو جس وضاحت کے ساتھ پروفیسر پٹی رم سوروکن نے بیان کیا ہے شاید ہی کسی مغربی مفکر کو اس کی توفیق نہ ہوئی ہو۔ پروفیسر پٹی رم سوروکن جس کو امریکی رسالہ سوشیالوجی اور سوشل ریسرچ (THE GREATEST MIND OF THIS GENERATION قرار دیتا ہے حال ہی میں امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کی سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ کی صدارت سے پنشن پاکر سبکدوش ہوا ہے اس نے "ہمارے دور کا بحران" THE CRISIS OF OUR AGE کے عنوان سے صرف یہ بتانے کے لئے ساڑھے تین سو صفحات کی ایک کتاب لکھی ہے کہ مغربی تہذیب ایک "ہولناک بحران" تک پہنچ گئی ہے جو عنقریب اس کی "تباہی" کا موجب ہوگی اور یہ تباہی "دورِ حاضر کے انسان کے لئے ذلت اور نکبت" کا پیغام اپنے ساتھ لائے گی۔ وہ کہتا ہے کہ مغربی تہذیب کے اس بحران کا سبب یہ ہے کہ:

"وہ اس اعتقاد کی بنیاد پر وجود میں آئی تھی کہ سچی صداقت اور سچی نیکی دونوں کلیتہً یا بیشتر حسی اور

مادی ہیں۔ ہر وہ چیز جو حواسِ خمسہ کی گرفت سے بالا ہے بطور صداقت کے فرضی ہے۔ یا تو اس کا کوئی وجود ہی نہیں یا اگر کوئی وجود ہے تو چونکہ وہ حواسِ خمسہ سے معلوم نہیں کیا جا سکتا وہ غیر موجود کے حکم میں ہے۔ چونکہ سچی صداقت یا سچی نیکی کو مادی یا حسی قرار دے لیا گیا تھا۔ ہر وہ چیز جو حواس کے ادراک سے ماوراء تھی خواہ وہ خدا کا تصور تھا یا انسان کا شعور۔ ہر وہ چیز جو غیر حسی اور غیر مادی تھی اور جو روزمرہ کے تجربات میں دیکھی، سنی، چھوئی یا سونگھی نہیں جا سکتی تھی۔ ضروری تھا کہ اُسے غیر حقیقی، غیر موجود اور بے سود قرار دے دیا جاتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس شجرکاری کا پہلا زہر آلود پھل یہ تھا کہ سچی صداقت اور سچی نیکی کے دائرہ کو ایک حد تک محدود کر دیا گیا۔ اور جب تہذیب ایک بار اس راستہ میں داخل ہو گئی تو پھر اس کو اسی راستہ پر آگے جانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صداقت اور نیکی کی دنیا ہر روز اور زیادہ حسیت اور مادیت کے تنگ سانچوں میں ڈھلتی گئی۔"

سوروکن آخر کار اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ دورِ حاضر کی حسیت زدہ تہذیب (SENSATE CIVILIZATION) کو بچانے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ اپنے حسیت زدہ بنیادی مفروضہ کو بدل کر اس کی جگہ کسی روحانی مفروضہ کو اپنی بنیاد بنائے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ اس

"حسیت زدہ تہذیب کے تمام مفروضوں اور تمام قدروں کا نئے سرے سے گہرا مطالعہ کیا جائے۔ اس کی خارج از وقت کاذب اقدار کو رد کیا جائے اور ان سچی قدروں کو بحال کیا جائے جو اس نے رد کر دی ہیں ... مذہب اور سائنس کا موجودہ اختلاف حد درجہ تباہ کن ہی نہیں بلکہ غیر ضروری بھی ہے اگر سچی صداقت اور سچی نیکی کے معقول اور تسلی بخش نظریہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو مذہب اور سائنس دونوں ایک ہی ہیں اور ایک ہی مقصد کو پورا کرتے ہیں اور وہ مقصد یہ ہے کہ قادرِ مطلق خدا کی صفات کو اس مرئی دنیا کے اندر آشکار کیا جائے تاکہ خدا کے نام کا بول بالا ہو اور انسان کی عظمت پایۂ ثبوت کو پہنچے۔"

لیکن مغربی تہذیب کے علمبردار اسلام کی راہ نمائی کے بغیر خدا اور سائنس کا الحاق نہیں کر سکیں گے۔ کچھ اس لئے کہ ان کے ہاں خدا کا عقیدہ شرک کی آلودگیوں سے پاک نہیں اور کچھ اس لئے کہ دین اور دنیا کی جدائی کا عقیدہ پھر ان کے آڑے آئے گا اور پھر کچھ اس لئے بھی کہ اب ان کا مرض حد سے زیادہ ترقی کر چکا ہے اور ان میں خدا پرستی کی طرف خود بخود رجوع کرنے کی قوت باقی نہیں رہی۔ لیکن اگر مغربی تہذیب نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اسلام کی

اخلاق کو قبول کیا تو یہ بات پھر ثابت ہو جائے گی کہ درحقیقت خدا نے مسلمانوں کو اقوام عالم کی قیادت کے منصب پر فائز کر رکھا ہے کہ خدا کا نور بجھایا نہیں جا سکتا اور یہ کہ خدا نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ اس لئے بھیجا ہے کہ اس کا دین تمام نظریات پر غالب آئے۔

اسلام ہر اس پروگرام تجویز اور طریق کار کا حامی ہے جس سے اسلام کی واقفیت اور بصیرت رکھنے والوں کی رائے میں معاشی عدل کے تقاضے پورے ہوتے ہوں خواہ وہ زکوٰۃ کی فراہمی کا اہتمام ہو یا اس کے بعد یا اس کے ساتھ ہی بعض ذرائع پیداوار کو قومیانے کا انتظام۔ لیکن انسان فقط جسم نہیں بلکہ وہ خودی یا روح بھی ہے اور خودی یا روح اصل انسان ہے جو جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور جسم اصل انسان کی سواری ہے اور یہ سواری خواہ اسے کھلا پلا کر کتنا ہی موٹا کیا جائے صرف قبر تک ہی کام دیتی ہے۔ جسم کی طرح خودی کو بھی غذا اور لباس اور مکان کی ضرورت ہے۔ خودی کی غذا خدا کی صفات کا حسن ہے (ولله الاسماء الحسنیٰ) جو خودی اپنے اندر خدا کی عبادت اور خدا کی محبت کے سوز و گداز سے جذب کرتی ہے۔ قرآن میں ہے کہ دلوں کی اشتہائے حسن خدا کے ذکر سے مطمئن ہوتی ہے الا بذکر الله تطمئن القلوب۔ اور خودی کا لباس تقویٰ اور تخلق باخلاق اللہ ہے۔ قرآن میں ہے ولباس التقویٰ ذالك خير اور خودی کا مکان جنت ہے۔ قرآن میں ہے کہ وہ لوگ جو خودی کی ضرورتوں کو سمجھتے ہیں ان کو جنت میں اونچے اونچے محل دیئے جائیں گے اس لئے کہ انہوں نے ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے صبر سے کام لیا تھا اولئك يجزون الغرفة بما صبروا۔ جس طرح سے جسم اپنی ضرورتوں کے پورا نہ ہونے سے مرتا ہے خودی بھی اپنی ضرورتوں کے پورا نہ ہونے سے مرتی ہے۔ خدا کہتا ہے کہ قرآن کی آواز تمہیں زندگی کی طرف بلاتی ہے اس کو سنو اور مانو اور خدا اہل ایمان کے لئے حیات طیبہ کا وعدہ کرتا ہے۔ جسم کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ خودی کے کام آئے تاکہ خودی اس کی مدد سے اپنی ابدی زندگی اور مسرت کا اہتمام کرے۔ لیکن اگر خودی کی ضرورتوں کو بالکل بھلا دیا جائے تو پھر جسم کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا فائدہ کیا ہے۔ جسم کی بھوک برہنگی اور بے خانگی سے عارضی موت مرنے والوں کی تعداد کم ہے لیکن خودی کی بھوک، برہنگی اور بے خانگی سے ابدی موت مرنے والے ان گنت ہیں اور روز ہماری آنکھوں کے سامنے مرتے رہتے ہیں۔ لیکن ہمیں ان پر رحم نہیں آتا ہم ان کے افلاس پر آنسو نہیں بہاتے اور اس کا مداوا نہیں کرتے۔ کیا وجہ ہے کہ ہمیں اپنی ناپائیدار سواری کی فکر ہے لیکن اپنی فکر بالکل نہیں۔ ہمیں کہنا چاہیئے کہ غذا لباس اور مکان ہماری سواری کو دو لیکن ہمیں بھی دو۔ اگر جسم کے افلاس کا علاج اچھی معیشت ہے تو خودی کے افلاس کا علاج اچھی تعلیم ہے جو خودی کی ضروریات کو پورا کرے لہٰذا اچھی معیشت اور اچھی تعلیم کو ساتھ ساتھ رکھا جائے۔

ملتِ اسلامیہ کے نام اقبال کا پیغام

خلاصہ رموزِ بے خودی

مرتبہ: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

جس طرح "خودی" کے معنی تکبر یا غرور کے نہیں ہیں اسی طرح بے خودی کے معنی بے ہوشی یا خود فراموشی کے نہیں۔ بلکہ یہ فرد کی زندگی کی اس کیفیت کا نام ہے جو جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔

(۱) ربط فرد و ملت

علامہ فرماتے ہیں کہ فرد تنہا زندگی بسر کرنے کے لئے نہیں پیدا ہوا، جہاں تک ہو سکے جماعت کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ چنانچہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں "شیطان جماعت سے دور رہتا ہے"۔

فرد می گیرد ز ملت احترام ملت از افراد می یابد نظام[1]

فرد قوم سے جدا ہو کر اپنی ہستی کھو بیٹھتا ہے اور ترقی کی جملہ راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

ہر کہ آب از زمزم ملت نخورد شعلہ ہائے نغمہ در عودش فسرد[2]

انسان کے اندر "جوہر نوری" ہے۔ قوت ادراک اسی کی ایک شعاع ہے۔ اس کی ترقی جماعت میں رہ کر ہی ہو سکتی ہے۔

فطرتش آزاد و ہم زنجیری است جزو او را قوت کلی گیری است[3]

---

[1] فرد ملت ہی سے احترام حاصل کرتا ہے اور ملت افراد ہی کی بدولت منظم ہوتی ہے۔

[2] جس شخص نے ملت کے زمزم سے پانی نہ پیا تو اس کے نغمات کے شعلے اس کے عود (ساز) میں فسردہ (مردہ) ہو کر رہ جائیں گے۔

[3] انسان کی فطرت آزاد بھی ہے اور مقید بھی ہے اور اس کے جزو میں کل کو گرفت میں لانے کی قوت پوشیدہ ہے۔

در جماعت خودشکن گردد خودی   تا ز گلبرگے چمن گردد خودی[۱]

(۴) ملت اختلاطِ افراد سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی تربیت کی تکمیل نبوت سے ہوتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ انبیا کو اس لئے بھیجتا ہے کہ وہ مختلف الخیال افراد کو ایک سلک میں منسلک کر کے قوم بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ نے ایک قوم بنا دیا اور عربوں کو سرکارِ مدینہؐ نے۔

محفلِ انجم ز جذبِ باہم است   ہستیِ کوکب ز کوکب محکم است[۲]

نبی افراد کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

گویدش تو بندۂ دیگر نۂ   زیں بتانِ بے زباں کمتر نۂ[۳]

اس کے بعد انہیں ایک سلک میں منسلک کرتا ہے۔

تا سوئے یک مدعا یش می کشد   حلقۂ آئیں بپایش می کشد[۴]
نکتۂ توحید باز آموزدش   رسم و آئینِ نیاز آموزدش[۵]

(۳) ارکان اساسی (BASIC PRINCIPLS OF ISLAM)

(۵) اسلام کا رکن اوّل توحید ہے۔ یہ اسلام کا امتیازی نشان ہے۔ اور اسلام کا سارا فلسفہ اسی توحید میں مضمر ہے۔

عقلِ انسانی اسی توحید کی بدولت منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ ورنہ اس بے چاری کو ساحل کہاں مل سکتا ہے؟ مومن میں دین حکمت آئین نور قوت اور تمکین سب توحید کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب مسلم حقیقی معنی میں خدائے واحد کا پرستار ہو جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟

بیم و شک میرد عمل گیرد حیات   چشم می بیند ضمیرِ کائنات[۶]

---

[۱] جماعت سے وابستہ رہ کر خودی خودشکن بن جاتی ہے لیکن اس کا ثمرہ یہ ملتا ہے کہ وہ خودی پھول کی پتی سے ترقی کر کے چمن ہو جاتی ہے۔

[۲] ستاروں کی محفل جذبِ باہمی پر موقوف ہے اور ایک ستارے کی ہستی دوسرے ستارے کی بدولت محکم ہے۔

[۳] نبی کہتا ہے کہ تو کسی انسان کا بندہ نہیں ہے اور ان بتانِ بے زباں سے کمتر نہیں ہے۔

[۴] تاکہ انہیں ایک اور صرف ایک مقصد پر متحد کر سکے وہ (نبی) ان کے پاؤں میں قانون کی بیڑیاں ڈال دیتا ہے۔

[۵] انہیں توحید کا نکتہ ازسرِنو سکھاتا ہے۔ نیز تسلیم و رضا کا قانون سکھاتا ہے۔

[۶] خوف اور شک دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور عمل کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی آنکھ کائنات کی مخفی طاقتوں کو دیکھ سکتی ہے۔

چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود   کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود[۱]

ملتِ اسلامیہ کے لئے توحید بمنزلہ روح رواں ہے۔ اگر توحید کا تصور خارج کر دیا جائے تو ملتِ اسلامیہ لاشۂ بے جان رہ جائے گی۔

ملتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ   ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ[۲]
لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما   رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما[۳]

چونکہ اسلام کا خدا ایک ہے اس لئے ملتِ اسلامیہ کا مقصود بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔

ملت از یک رنگیِ دلہا ستے   روشن از یک جلوہ ایں سینا ستے[۴]
قوم را اندیشہ ہا باید یکے   در ضمیرش مدعا باید یکے[۵]

مسلمان کو حسب و نسب پر نازاں نہیں ہونا چاہیئے "اکرمکم عند اللّٰہ اتقٰکم"

بر نسب نازاں شدن نادانی است   حکم او اندر تن و تن فانی است[۶]
ملتِ ما را اساس دیگر است   ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است[۷]
ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم   یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم[۸]

(۳) ب: یاس و حزن و خوف اُمّ الخبائث ہیں اور حیات کے دشمن ہیں توحید پر اگر کامل ایمان ہو تو ان امراض کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ کبھی نا امید نہ ہو۔ کیونکہ نا امیدی، حیات کے لئے سامانِ مرگ ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لا تقنطوا من رحمۃ اللّٰہ"

---

[۱] جب عبدہٗ کا مقام محکم ہو جاتا ہے تو مسلمان کا بھیک مانگنے کا پیالہ جامِ جمشید بن جاتا ہے۔

[۲] ملتِ بیضا بمنزلہ تن ہے اور کلمۂ توحید اس کے حق میں بمنزلہ روح ہے۔ یہ توحید ہی ہمارے سازِ ہستی کے پردوں کو گردش دیتی ہے۔

[۳] کلمۂ توحید ہی ہمارے تمام اسرارِ حیات کا سرمایہ ہے اور اس کا دھاگا ہی ہمارے تمام افکار کا شیرازہ ہے۔

[۴] ملت کا وجود دلوں کی یک رنگی پر موقوف ہے اور یہ کوہ سینا (ملت) ایک ہی جلوے سے منور ہے۔

[۵] قوم کے افراد کے دماغوں میں ایک ہی تصور ہونا چاہیئے اور ان کے دلوں میں ایک ہی مقصود ہونا چاہیئے

[۶] نسب پر ناز کرنا نادانی ہے کیونکہ اس کا حکم صرف جسم پر نافذ ہے اور جسم فانی ہے۔

[۷] ہماری ملت کی بنیاد کچھ اور ہی ہے اور یہ بنیاد ہمارے دلوں میں پوشیدہ ہے۔

[۸] ہم حضورؐ کی تعلیم کی برکت سے بھائی بھائی بن گئے ہیں اور یک زبان، یک دل اور یک جان ہو گئے ہیں۔

اے کہ در زندان غم باشی اسیر   از نبی تعلیم لا تحزن بگیر[1]
قوت ایمان حیات افزایدت   ورد لا خوف علیہم بایدت[2]
بیم غیر اللہ عمل را دشمن است   کاروان زندگی را رہزن است[3]
ہر شرے پنہاں کہ اندر قلب تست   اصل او بیم است اگر بینی درست[4]
ہر کہ رمز مصطفیٰ فہمیدہ است   شرک را در خوف مضمر دیدہ است[5]
خوف حق عنوان ایمان است و بس   خوف غیر از شرک پنہاں است و بس[6]

(۴) رکن دوم رسالت: جس چیز کی توحید کے بعد ضرورت ہے وہ ایمان بر رسالت ہے۔ رسالت پر ایمان لانے سے تن مردہ میں جان آ جاتی ہے اور دین و آئین کی بنیاد رسالت ہی ہے۔ رسولؐ، مسلم کے قلب و جگر کی قوت ہوتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ پیارا ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیں خدا تک پہنچاتا ہے۔ اس کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا مسلمان کے لئے موت کا حکم رکھتا ہے۔

سرکارِ مدینہ نے ہمیں دینِ حق اور مذہب فطرت عطا کیا اور اس لئے کہ ہماری وحدت میں کوئی تفرقہ پیدا نہ ہو اور ہماری ہستی ابدی ہو جائے۔ خدا نے ہمارے رسولؐ پر رسالت ختم کر دی۔

قوتِ قلب و جگر گردد نبی   از خدا محبوب تر گردد نبی[7]

---

[1] اے مومن! تو غم کے زندان میں قید ہے اپنے نبیؐ سے "لا تحزن[8]" کی تعلیم سیکھ۔

[2] ایمان کی قوت تیری حیات کو بڑھا سکتی ہے اس لئے تجھے "لا خوف علیہم" کا ورد کرنا چاہئے۔

[3] غیر اللہ کا خوف، عمل کا دشمن ہے اور زندگی کے قافلے کا رہزن ہے۔

[4] تیرے قلب میں جو بھی برائی پوشیدہ ہے اگر تو غور کرے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ اس کی بنیاد غیر اللہ کا خوف ہے۔

[5] جس نے بھی آنحضرت صلعم کی تعلیم کی روح کو سمجھ لیا ہے اس پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ شرک دراصل خوف میں پوشیدہ ہے یعنی جو غیر اللہ سے ڈرتا ہے وہ دراصل مشرک ہے۔

[6] اللہ سے ڈرنا ہی ایمان کا عنوان ہے اور کچھ نہیں۔ غیر اللہ کا خوف (غیر اللہ سے ڈرنا) ہی شرک پنہاں ہے اور کچھ نہیں۔

[7] نبیؐ مسلمان کے قلب و جگر کی قوت بن جاتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ محبوب ہو جاتا ہے۔

[8] لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔

دین فطرت از نبی آموختیم   در رہِ حق مشعلے افروختیم[1]
لا نبی بعدی ز احسان خداست   پردۂ ناموس دین مصطفیٰ است[2]

(۴) ب: رسالت محمدیؐ کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کے اندر حریت و اخوت و مساوات قائم ہو جائے۔

آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے انسان انسان پرست تھا۔ آنحضرتؐ نے دنیا کو حریت و اخوت و مساوات کا سبق پڑھایا۔

انما المومنون اخوۃ اندر دلش   حریت سرمایۂ آب و گلش[3]
ناشکیب امتیازات آمدہ   در نہاد او مساوات آمدہ[4]

اس کے بعد علامہ نے تاریخ اسلامی سے ان تینوں کی مثالیں دی ہیں۔ حریت کی مثال میں امام حسینؓ کی شہادت پیش کی ہے۔

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است   پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است[5]
ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست   پیش فرعونے سرش افگندہ نیست[6]
رمز قرآں از حسینؓ آموختیم   ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم[7]

رمز قرآن سے علامہ کی مراد یہ ہے کہ مسلمان کو ہر حال میں باطل کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو جان دینے سے دریغ نہ کرنا چاہیے۔

(۵) چونکہ ملت محمدیؐ کی بنیاد توحید اور رسالت پر ہے اور یہ حقائق محدود فی المکان نہیں ہیں اس لئے ملت محمدیؐ بھی محدود فی المکان نہیں۔ اس لئے:

---

[1] ہم نے دین فطرت نبیؐ سے سیکھا اور اس طرح راہ حق میں ایک شمع روشن کر دی۔

[2] حضورؐ کا یہ ارشاد کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، دراصل خدا کا احسان ہے جو اس نے بندوں پر کیا ہے اور یہ عقیدہ پردۂ ناموس مصطفیٰؐ ہے۔

[3] مسلمان کے دل میں یہ عقیدہ راسخ ہے کہ سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں اور حریت کا عقیدہ اس کی ہستی کا سرمایہ ہے۔

[4] مسلمان امتیازات کو برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ مساوات کا عقیدہ اس کی نہاد (سرشت) میں سما گیا ہے۔

[5] وہ حق کے لئے خاک اور خون میں لوٹا۔ اس طرح وہ لا الٰہ کی بنیاد بن گیا۔

[6] مسلمان ماسوی اللہ کا غلام نہیں ہو سکتا اور اس کا سر کسی فرعون کے آگے نہیں جھک سکتا۔

[7] ہم نے قرآن کی رمز حسینؓ سے سیکھی اس کی آگ سے بہت سے شعلے جمع کئے۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا   مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
مسلم استی دل با قلیمے مبند   گم مشو اندر جہاں چون و چند[1]
دل بدست آور کہ در پہنائے دل   می شود گم ایں سرائے آب و گل[2]

آنحضرتؐ نے اپنے وطن سے ہجرت کر کے مسلم کی قومیت کا عقدہ حل کر دیا۔ مدینہ کو وطن بنا لیا جو آپؐ کا جائے ولادت نہیں تھا۔ یعنی تمام دنیا مسلمان کا وطن ہے اور تمام زمین اس کے لئے مسجد ہے۔

ہجرت آئین حیات مسلم است   ایں ز اسباب ثبات مسلم است[3]
صورت ماہی بہ بحر آباد شو   یعنی از قید مقام آزاد شو[4]
ہر کہ از قید مقام آزاد شد   چوں فلک در شش جہت آباد شد[5]

(۶) وطن اساس ملت نہیں ہے۔ وطنیت کے عقیدہ کو علامہ مسلمان قوم کے لئے از بس مضر خیال کرتے ہیں کیونکہ اس کی بنا پر اخوت کا زریں اصول تباہ ہو جاتا ہے۔ جو لوگ ملت کی تعمیر وطنیت کے اصولوں پر کرتے ہیں وہ نوع انسان کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں۔ دنیا میں جو کچھ ہنگامہ بپا ہے اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی نظر آتی ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔ اساس ملت وطن نہیں بلکہ مذہب ہے:

تا سیاست مسند مذہب گرفت   ایں شجر در گلشن مغرب گرفت[6]
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند   آدمیت گم شد و اقوام ماند[7]

(۷) جس طرح ملت محمدی محدود فی المکان نہیں اسی طرح مقید بالزمان بھی نہیں۔ اگرچہ فرد و ملت کی اجل مقرر ہے اور ملت بھی فرد کی طرح مردہ ہو جاتی ہے۔ لیکن ملت محمدی اجل سے محفوظ ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس ملت کی بقا کا خود وعدہ فرمایا ہے۔

---

[1] تو مسلم ہے اس لئے اپنا دل کسی خاص اقلیم سے مت لگا اور اس جہان چون و چند میں گم مت ہو جا۔

[2] دل کی دولت حاصل کر کیونکہ یہ جہان آب و گل دل کی وسعت میں گم ہو جاتا ہے۔

[3] ہجرت مسلمان کی زندگی کا قانون ہے یہ مسلمان کے ثبات کے اسباب میں سے ہے۔

[4] مچھلی کی طرح سمندر میں آباد ہو جا یعنی قید مکاں سے آزاد ہو جا۔

[5] جو شخص قید مکاں سے آزاد ہو گیا وہ آسمان کی طرح کائنات میں آباد ہو گیا۔

[6] جب سیاست نے مذہب کی مسند پر قبضہ کر لیا تو مغرب کے گلشن میں یہ شجر پروان چڑھا۔

[7] نتیجہ یہ نکلا کہ جسم سے روح نکل گئی صرف جسم باقی رہ گیا آدمیت تو گم ہو گئی صرف اقوام باقی رہ گئیں۔

ملت مسلم ز آیات خدا است   اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ است[1]
از اجل ایں قوم بے پرواستے   استوار از نحن نزلنا ستے[2]
تا خدا ان یطفئوا فرمودہ است   از فسردن ایں چراغ آسودہ است[3]

(۸) نظام ملت کسی ضابطہ کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا اور اس لئے خدا نے نظام ملت کے قیام و ثبات کے لئے قرآن پاک نازل فرمایا ہے۔ پس اگر مسلمان اپنا ملی نظام استوار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں قرآن کو اپنا دستور حیات اور ضابطہ عمل بنانا چاہئے۔

ہستی مسلم ز آئین است و بس   باطن دین نبیؐ ایں است و بس[4]
آں کتاب زندہ قرآن حکیم   حکمت او لا یزال است و قدیم[5]
حرف اورا ریب نے تبدیل نے   آیہ اش شرمندۂ تاویل نے[6]
نوع انساں را پیام آخریں   حامل او رحمۃ للعالمیں[7]

اس کے بعد علامہ نے مسلم سست پیماں سے خطاب کیا ہے اور دو لفظوں میں راز حیات بیان کر دیا ہے:۔

اے گرفتار رسوم ایمان تو   شیوہ ہائے کافری زندان تو[8]
قطع کر دی امر خود را در زبر   جادہ پیمائی الیٰ شیئ نکر[9]
گر تو می خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بقرآں زیستن[10]

---

[1] مسلمان قوم خدا کی نشانیوں میں سے ہے اور اس کی اصل "قالوا بلیٰ" کے ہنگامے سے ہے۔

[2] یہ قوم موت سے بے پروا ہے اور "نحن نزلنا" سے استوار ہے۔

[3] چونکہ خدا نے "ان یطفئوا" فرما دیا ہے اس لئے یہ چراغ بجھ جانے سے محفوظ ہو گیا ہے۔

[4] مسلمان کی ہستی صرف آئین پر موقوف ہے۔ نبیؐ کے دین کا باطن صرف یہی ہے اور کچھ نہیں۔

[5] قرآن حکیم زندہ کتاب ہے اور اس کی حکمت لازوال اور قدیم ہے۔

[6] اس کے الفاظ شک اور تغیر سے پاک ہیں اور اس کی آیات تاویل سے بے نیاز ہیں۔

[7] یہ کتاب نوع انساں کے لئے پیام آخریں ہے اور رحمۃ للعالمینؐ اس کے حامل ہیں۔

[8] اے مسلمان تو رسوم میں گرفتار ہو چکا ہے اور کفر کے طریقے تیرے حق میں زنداں بن گئے ہیں۔

[9] تو نے "زبر" میں اپنے امر کو قطع کر دیا اور تو "الیٰ شیئ نکر" کے صحرا میں جادہ پیما ہو گیا۔

[10] اگر تو مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتا ہے تو یہ ممکن نہیں جب تک تو صرف قرآن کو اپنا دستور نہیں بنائے گا۔

(۹) انحطاط کے زمانہ میں تقلید کرنا اجتہاد کرنے سے زیادہ مفید ہے۔ یہاں تقلید کے معنی فقہی نہیں ہیں۔ بلکہ روایاتِ قومی پر عامل ہونے کے ہیں۔ علامہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

گر تقلید بودے شیوہ نیک   پیمبر ہم رہ اجداد رفتے[1]

یعنی تقلید کو برا بتایا ہے۔ اس جگہ تقلید کو اجتہاد سے اولیٰ تر قرار دیا ہے پس معلوم ہوا کہ وہاں تقلید کے معنی کورانہ پیروی کے ہیں اور یہاں تقلید کے معنی اپنی ثقافتی روایات (CULTURAL TRADITIONS) کی حفاظت اور ان پر عمل کرنا ہیں۔ لکھتے ہیں:-

راہ آبا رو کہ این جمعیت است   معنی تقلید ضبط ملت است[2]

اس شعر میں خود بھی تقلید کے معنی صاف کر دیئے ہیں۔

نقش بر دل معنی توحید کن   چارۂ کار خود از تقلید کن[3]
اجتہاد اندر زمان انحطاط   قوم را برہم ہمی پیچد بساط[4]
ز اجتہاد عالمان کم نظر   اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر[5]
از یک آئینی مسلمان زندہ است   پیکر ملت ز قرآن زندہ است[6]
ما ہمہ خاک و دل آگاہ اوست   اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست[7]

الغرض تقلید کے معنی ہیں قرآنی احکام کی بے چون و چرا تعمیل کرنا اور یک آئینی کو اپنا نصب العین بنانا۔ سنتِ نبویؐ پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنا اور ہر معاملہ میں قرآن سے فیصلہ طلب کرنا۔

(۱۰) اتباعِ آئینِ الٰہیہ سے سیرتِ ملی میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عنوان حرزِ جاں بنانے کے لائق ہے فرماتے ہیں کہ قرآن وہ ہیرا ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے تراشا ہے۔ اس میں سراسر نور اور روشنی ہے اس کا ظاہر بھی موتی ہے اور باطن بھی موتی ہے۔ اس کا ظاہر و باطن دونوں ایک ہے۔ علم حقیقت شریعت

---

[1] اگر تقلید کرنا کوئی نیک طریقہ ہوتا تو پیغمبرؐ بھی اپنے باپ دادا کے مذہب کی تقلید کرتے۔

[2] اپنے بزرگوں کی راہ پر چل کیونکہ جمعیت اسی صورت سے حاصل ہوگی۔ تقلید کا مطلب ہے ملت کے قانون کا اتباع۔

[3] توحید کا مطلب اپنے دل پر نقش کرلے اور تقلید سے اپنے طرزِ عمل کو درست کرلے۔

[4] انحطاط کے زمانے میں اجتہاد کرنا گویا قوم کی بساط کو لپیٹ دینا ہے۔

[5] عالمان کم نظر کے اجتہاد سے اسلاف کی پیروی کرنا بہتر ہے۔

[6] مسلمان یک آئینی سے زندہ ہے اور ملت کا جسم قرآن کی بدولت زندہ ہے۔

[7] ہم سب خاک ہیں صرف قرآن دل آگاہ ہے اسے مضبوطی سے تھام لے کیونکہ وہ "اللہ کی رسی" ہے۔

سے جدا نہیں ہے اور سنت کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرتؐ سے محبت کی جائے۔ ہر کہ عشق مصطفیٰ الخ اگر مسلمان اپنے ایمان کو مضبوط اور شاداب رکھنا چاہتے ہیں تو اتباع شریعت کریں۔ ملت کا نظام اتباع شریعت پر مبنی ہے۔ جب یہ نظام محکم ہو جاتا ہے تو ملت کو دوام نصیب ہو جاتا ہے۔ لوگ اسلام کا "راز" (SECRET) پوچھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ شریعت ہی اسلام کا راز ہے۔

اگر کوئی قوت اتباع شریعت میں مزاحم ہو تو اس کا مقابلہ کرنا فرض ہے

سرِ این فرمان حق دانی کہ چیست   زیستن اندر خطرہا زندگیست[1]

آنحضرت صلعم کا دین زندگی بخشنے والا دین ہے۔

ہست دین مصطفیٰ دین حیات   شرع او تفسیر آئین حیات[2]

جب سے مسلمانوں نے شعارِ نبوی سے روگردانی کی رمزِ بقا سے محروم ہو گئے۔

تا شعار مصطفیٰ از دست رفت   قوم را رمز بقا از دست رفت[3]

آخر میں نصیحت کی ہے کہ عجمی خیالات سے پرہیز کرو کیونکہ وہ حدود اسلام سے تجاوز کرنا سکھاتے ہیں۔ عرب سے الفت پیدا کرنا چاہیئے۔

با مریدے گفت اے جان پدر   از خیالات عجم باید حذر[4]
زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گزشت   از حد دین نبیؐ بیروں گزشت[5]
قلب را زین حرف حق گرداں قوی   با عرب در ساز تا مسلم شوی[6]

(۱۱) سیرتِ قومی میں اتباعِ رسولؐ سے حسن و خوبی پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مرشد رومیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:-

مگسل از ختم الرسلؐ ایام خویش   تکیہ کم کن بر فن و بر گام خویش[7]

---

[1] کیا تو جانتا ہے کہ اس فرمان کا راز کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ خطروں میں زندگی بسر کرنا ہی حقیقی زندگی ہے۔

[2] دین مصطفیٰ دین حیات ہے اور اس کی شریعت آئین حیات کی تفسیر ہے۔

[3] جب سے مسلمانوں نے شعار مصطفیٰ ترک کر دیا اس وقت سے قوم رمزِ بقا سے محروم ہو گئی۔

[4] ایک مرید سے کہا کہ اے جان پدر! تجھے خیالات عجم سے بچنا لازم ہے۔

[5] (کیونکہ) اگرچہ اس کی فکر آسمانوں سے بھی اونچی ہو گئی لیکن دین نبیؐ کی حدود سے متجاوز ہو گئی۔

[6] اپنے دل کو حرف حق (قرآن) سے مضبوط کر عرب سے موافقت پیدا کر تاکہ تو مسلمان ہو سکے۔

[7] اپنی زندگی کا رشتہ ختم الرسلؐ سے مت توڑ۔ نیز اپنے فن اور اپنے قدم پر بھروسا مت کر۔

مسلمانوں کے لئے حضرت ختمی مرتبتؐ کی ذات ستودہ صفات بہترین نمونہ ہے۔ اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو رہنما بنانا کار نادانی ہے۔

غنچہ از شاخسار مصطفیٰ گل شو از باد بہار مصطفیٰ[1]
از بہارش رنگ و بو باید گرفت بہرۂ از خلق او باید گرفت[2]
آنکہ مہتاب از سر انگشتش دو نیم رحمت او عام و اخلاقش عظیم[3]
از مقام او اگر دور ایستی از میان معشر ما نیستی[4]

---

[1] اے مسلمان تو مصطفیٰؐ کی شاخ کا ایک غنچہ ہے اس لئے مصطفیٰؐ کی باد بہاری سے پھول بن جا۔
[2] تجھے آپؐ کی بہار سے رنگ و بو حاصل کرنی چاہیئے اور آپؐ کے خلق سے کچھ حصہ حاصل کرنا چاہیئے۔
[3] جس کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا آپؐ کی رحمت عام ہے اور آپؐ کے اخلاق عظیم ہیں۔
[4] اگر تو آپؐ کے مقام سے دور ہے تو پھر ہماری جماعت میں سے نہیں ہے۔

ہندوستان کا مشہور دینی مجلہ
ماہنامہ الفرقان لکھنؤ
جو ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء سے نکل رہا ہے
بانی و مدیر: مولانا محمد منظور نعمانی —— مرتب: عتیق الرحمٰن سنبھلی
● اپنے قارئین کو دین کے صحیح علم و فہم میں مدد دیتا ہے۔
● اس کے مضامین ذوق عمل اور روحانی گداز بخشتے ہیں۔
● اس کے ذریعہ ہر مہینہ اپنے دینی فکر اور دینی حالت کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔
● جن لوگوں کو دینی مسائل پر حقیقت پسندانہ غور و فکر سے دلچسپی ہے الفرقان کے اداریے ان کی اس دلچسپی کا بھی بھرپور سامان ہیں
پوری واقفیت کے لیے نمونہ کا پرچہ مفت طلب فرمائیے
سالانہ چندہ برائے ہندوستان و پاکستان ۱۵/ر، ششماہی ۸/ر دیگر ممالک سے سالانہ ۱۵ شلنگ
منیجر ماہنامہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ
پاکستان میں خریداری کے لئے سیکرٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگس لاہور سے رجوع کریں

تاریخ تصوف اسلامی

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ (۲)

تعلیمات

تمہید صوفیا کی زندگی کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ جو شخص صحیح معنی میں کسی ایسے مذہب کا پیرو ہے جس میں خدا کو معبود، مطلوب اور مقصود قرار دیا گیا ہے وہ لازماً یہ محسوس کرتا ہے کہ مجھ میں اور میرے خدا میں دوری ہے۔ چونکہ مطلوب کا قرب یا اس کی معیت کا حصول ہر طالب کا مطمح نظر ہوتا ہے اس لئے وہ قرب یا معیت کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ جس طریقے یا ذریعے سے وہ اپنے مطلوب کا قرب حاصل کرتا ہے، اسے اصطلاح میں تصوف کہتے ہیں۔

جنیدؒ نے تصوف کی بہت سی تعریفات بیان کی ہیں ان میں سے دو تعریفیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:-

(۱) تصوف یہ ہے کہ صوفی اس طرح خدا کی معیت میں زندگی بسر کرے کہ غیر اللہ سے اسے کوئی دل بستگی باقی نہ رہے۔ (رسالہ قشیریہ صفحہ ۱۲۷)

(ب) تصوف وہ کوشش یا درطلب کوشیدن[1] ہے جس میں ایک انسان اپنی پوری زندگی بسر کر دیتا ہے (یہاں کوشش سے مراد وہی حصول قرب یا معیت کی کوشش ہے)

جنیدؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ یہ کوشش خدا کی صفت ہے یا بندے کی؟ انہوں نے جواب دیا، درحقیقت تو یہ خدا کی صفت ہے لیکن بظاہر یا صورۃً بندے کی صفت ہے۔ (کشف المحجوب صفحہ ۳۶)

پہلی تعریف کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ غیر اللہ سے کلیۃً قطع نظر کرے گا تو دوری کا ازالہ ہو جائے گا۔ واضح ہو کہ قرآن حکیم نے اسی حالت کو تبتل سے تعبیر کیا ہے۔ اور اسی کو صوفیہ اس جملے سے ادا کرتے ہیں، سب سے توڑ، خدا سے جوڑ۔

---

[1] اندریں رہ می تراش و می خراش تا دم آخر دمے فارغ مباش

دوسری تعریف کا مطلب یہ ہے کہ جب دوری کا احساس مٹ جاتا ہے اور قرب حاصل ہو جاتا ہے تو صوفی پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ میری صفات دراصل خدا ہی کی صفات ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی صفات فنا ہو جاتی ہیں۔ ہجویریؒ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ حقیقی توحید میں انسانی صفات باقی ہی نہیں رہتیں۔ کیونکہ انسانی صفات قائم بالذات اور مستقل نہیں ہیں، محض موہوم ہیں سراسر غیر مستقل اور عارضی جیسے آئینے میں عکس۔ فاعل حقیقی صرف خدا ہے اس لئے وہ دراصل صفات باری ہیں۔"

جنیدؒ نے رسالۂ فنا میں اس حالت کی تشریح یوں کی ہے " اس فنا مطلق کی حالت میں صوفی کی ذاتی صفات زائل ہو جاتی ہیں اور اس زوال کے بعد اسے حضور کامل نصیب ہو جاتا ہے اور اس حضوری کی وجہ سے وہ اپنے آپ سے غائب ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ خدا کے سامنے حاضر اور اپنے آپ سے غائب ہو جاتا ہے تو بیک وقت وہ حاضر بھی ہوتا ہے اور غائب بھی ہوتا ہے۔"

جو حالت اس مکتوب میں بیان کی گئی ہے اسی کا دوسرا نام توحید ہے۔ جب تک ایک شخص اپنے آپ کو توحید میں اس طرح فنا نہ کر دے کہ اس کی نگاہ میں غیر کا وجود باقی نہ رہے وہ موحد نہیں ہو سکتا۔

یہ توحید ذاتِ باری ہی جنید کے مشاہدے اور تعلیم کا مرکزی یا بنیادی تصور ہے۔ جنید نے اسی مکتوب میں اس مرکزی تعلیم کی مزید توضیح کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں " اپنے آپ سے غائب ہو جانے کے بعد وہ پھر اس حالت میں واپس آ جاتا ہے جس میں وہ (قبل تخلیق) تھا۔ اب وہ اپنے کو موجود پاتا ہے۔ یعنی غیبت کے بعد اسے اپنا حضور حاصل ہو جاتا ہے۔ قبل ازیں وہ خدا میں حاضر تھا اپنے آپ میں غائب تھا۔ اب وہ خدا کے سامنے بھی حاضر ہے اور اپنے سامنے بھی۔ کیونکہ اب وہ غلبۂ ذات کے سُکر کی حالت سے باہر نکل آیا اور صحو کی حالت میں آ گیا۔ اب اس میں تفکر کی صفت پیدا ہو گئی جس کی بدولت وہ ہر شئے کو اس کا صحیح مقام دے سکتا ہے۔"

اس طرح جنید نے توحید کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن اور سنت کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھا اور تمسک بالقرآن کی بدولت وہ ان لغزشوں بلکہ گمراہیوں سے محفوظ رہے جن میں بعض وہ صوفی گرفتار ہو گئے جنہوں نے صرف حالتِ سُکر کو کافی سمجھ لیا (تفصیل کے لئے دیکھو رسالہ قشیریہ صفحہ ۱۳۷)

الغرض عقیدۂ توحید اور عقیدۂ صحو، یہ دو عقیدے جنید کے سارے نظام تصوف کے لئے بمنزلۂ سنگ بنیاد ہیں۔ آئندہ اوراق میں انہی دونوں عقیدوں کی شرح پیش کی جائے گی۔

عقیدۂ توحید

جنید کی زندگی (تیسری صدی) میں مسئلہ توحید تمام مذہبی مدارس فکر کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا خصوصاً معتزلہ

کو اس میں اس قدر شغف تھا کہ وہ لوگ انہیں "اصحاب التوحید" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ یہ لوگ اس مسئلے میں عقل کی روشنی میں غور و فکر کرتے تھے۔ ان کے برعکس صوفیہ چونکہ عقل کی نارسائی اور تنگ مائیگی سے آگاہ تھے۔ اس لئے وہ اس مسئلے کو وحی و الہام کی مدد سے حل کرتے تھے۔ چنانچہ پانچویں صدی ہجری کا ایک صوفی (ابن الکاتب) کہتا ہے " معتزلہ نے عقل کو رہنما بنا کر گمراہی کا راستہ اختیار کر لیا۔ لیکن صوفیہ دل کی ہدایت پر عمل کر کے منزل مقصود تک پہنچ گئے۔" (قشیری صفحہ ۲۷)

بہرکیف تقاضائے عصر خویش کی بنا پر جنید نے بھی اس اہم مسئلے پر غور و فکر کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ توحید باری کی منطقی تعریف نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "توحید کے بارے میں بہترین قول حضرت صدیق اکبرؓ کا ہے جو فرماتے ہیں کہ لائق حمد ہے وہ ذات جس نے اپنے بندوں پر اپنی ذات و صفات کے علم کا اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کھولا کہ وہ اس باب میں اپنے عجزِ فہم کا اعتراف کر لیں (العجز عن الادراک ادراک)" (کتاب اللمع صفحہ ۳۲)

اس سے معلوم ہوا کہ جنید کا نظریہ یہ ہے کہ توحید کا علم سرحد ادراک سے باہر ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ توحید وہ حقیقت ہے جس میں تمام آثار و علائم محو ہو جاتے ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ " والآن کما کان " باقی رہ جاتا ہے۔ (خدا آج بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ وہ تھا) رسالہ قشیریہ صفحہ ۱۳۵

ایک دفعہ لوگوں نے ان سے توحید کا مطلب پوچھا تو انہوں نے کہا " توحید وہ معنی ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی حالانکہ توحید کے معنی میں مکمل علم پوشیدہ ہے۔" (قشیری صفحہ ۱۳۵) حقیقت حال یہ ہے کہ تمام صوفیہ اس بات کے معترف ہیں کہ توحید کے معنی اور مفہوم کو لفظوں کے ذریعے سے بیان نہیں کر سکتے۔ چنانچہ علامہ ابن خلدون بھی یہی کہتے ہیں " دشواری کا منبع یہ ہے کہ کسی زبان میں ایسے الفاظ موجود نہیں ہیں جو توحید کے مفہوم کو واضح کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی زبان حقائق مجردہ کا بیان کما حقہ نہیں کر سکتی" (دیکھو مقدمہ ابن خلدون جلد سوم صفحہ ۸۰)

صوفیانہ زاویہ نگاہ سے توحید کی تعریف اس درجہ مشکل ہے کہ کوئی صوفی اس سے کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکا۔ مثلاً جب ذوالنون مصری سے لوگوں نے توحید کا معنی دریافت کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا " توحید یہ ہے کہ تمہیں اس بات کا علم ہو جائے کہ جب خدا کسی شئے کو موجود کرنا چاہتا ہے تو اسے کسی سبب کی حاجت نہیں ہوتی (اس کا ارادہ ہی شئے کو موجود کر دیتا ہے) نیز یہ کہ اس کا فعل تخلیق برابر جاری ہے (کل یوم ھو فی شان) اور ہر شئے کی علت اس کا یہی فعل تخلیق ہے اور اس کی کوئی علت نہیں ہے (ورنہ تسلسل لازم آئے گا) نیز یہ کہ تم جس شئے کا بھی تصور کرو یا کر سکتے ہو خدا اس سے مختلف ہے۔" (رسالہ قشیریہ صفحہ ۱۳۵)

ناظرین غور کریں کہ یہ بعینہٖ وہی تعریف ہے جو متکلمین اسلام نے عقائد کی کتابوں میں درج کی ہے (دیکھو شرح عقائد نسفی و جلالی و شرح مقاصد) اس تعریف میں تصوف کا مخصوص رنگ کہیں نظر نہیں آتا۔

جنید نے توحید کی تعریف میں بلاشبہ یہ کوشش کی ہے کہ تصوف کا رنگ بھی نظر آئے۔ چنانچہ انہوں نے توحید کی تعریف یوں کی ہے کہ "اَلتَّوْحِیْدُ اِفْرَادُ الْقَدِیْمِ عَنِ الْمُحْدَثِ" یعنی توحید یہ ہے کہ قدیم (واجب الوجود ہستی) کو محدث و ممکن الوجود ہستی) سے جدا کر دیا جائے۔ اس بلیغ جملے کا مطلب یہ ہے کہ:

(۱) اللہ تعالیٰ کی ذاتِ ازلی کو ذواتِ حادثہ (اشیائے مخلوق) سے متمیز کیا جائے۔ صرف ذاتِ ازلی کو مقصود بنایا جائے اور ماسوی اللہ سے قطع نظر کر لی جائے بلکہ اس کا ابطال کیا جائے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی صفاتِ ازلی کو اشیائے کائنات کی صفات سے متمیز کیا جائے۔ صرف صفات کو مطمحِ نظر بنایا جائے اور مخلوقات کی صفاتِ عارضی کا ابطال کیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ درحقیقت اللہ کی ذات و صفات کے علاوہ کوئی شے موجود نہیں ہے۔ جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب عارضی ہے ہالک ہے، فانی ہے، بے ثبات ہے اس لئے ناقابلِ التفات ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے افعال کو اشیائے کائنات کے افعال سے متمیز کیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ صرف وہی فاعل حقیقی ہے اس کے سوا اس کائنات میں کوئی فاعلِ حقیقی نہیں ہے۔ انسان کے افعال اللہ کی مشیت کے محتاج ہیں۔ اللہ اگر بندوں کو فعل کی قدرت طاقت اور قوت عطا نہ کرے تو کوئی شخص کوئی فعل یا حرکت نہیں کر سکتا ہے[1]

جنیدؒ نے اس امر کی صراحت بھی کی ہے کہ اللہ کی صفات اور اس کے افعال سب اس کی ذات میں مندرج ہیں یعنی اس طرح داخلِ ذات ہیں کہ ان میں کوئی امتیاز نہیں ہے اور جب سالک توحید کے اس مقام پر فائز ہوتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ صفات اور افعال سب ذات میں مندرج ہیں اور اس وقت وہ خود بھی کلی ذات میں جذب ہو جاتا ہے۔ "من تو شدم تو من شدی" والا معاملہ ہو جاتا ہے۔

جنید کی پیش کردہ یہ تعریف صوفیائے آئندہ کے لئے مشعلِ راہ بن گئی۔ سب نے اس کو اختیار کر لیا اور سب نے اپنے اپنے مذاقِ طبع کے مطابق اس کی تشریح کی۔ مثلاً ابونصر سراجؒ نے تفصیل کلام کے بعد لکھا ہے کہ "توحید باری تعالیٰ کا نہ بیان ہو سکتا ہے نہ اس کی تعریف ہو سکتی ہے" اور اپنی تائید میں جنید کا مقولہ پیش کیا ہے (دیکھو کتاب اللمع صفحہ ۳۰)

ہجویریؒ نے یہ لکھا ہے کہ "واضح ہو کہ خدا ازلی ہے اور تم سب فانی اور عارضی مظاہر ہو۔ تمہاری ذات کو خدا کی ذات سے کوئی نسبت یا علاقہ نہیں ہے اور نہ تمہاری صفات اور اس کی صفات میں کوئی شراکت اور مماثلت ہے اور نہ قدیم اور حادث (واجب اور ممکن) میں کوئی یگانگت یا علاقہ ہے" (کشف المحجوب صفحہ ۲۸۰)

امام قشیریؒ نے بھی جنید کے قول کی تصویب و تصدیق کی ہے (رسالہ صفحہ ۱۳۶)

---

[1] [illegible] فی القرآن، "ما شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ" "وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ"۔

تھانویؒ نے بھی توحید کی تشریح میں جنید ہی کی پیش کردہ تعریف کو اختیار کیا ہے کہ "التوحید افراد القدیم عن المحدث" (دیکھو کشاف اصطلاحات الفنون جلد ۲ صفحہ ۱۴۸۶)

حد ہے کہ ابن تیمیہ نے بھی جو نہایت راسخ العقیدہ سُنّی ہیں اور عجمی یا ایرانی تصوف کے شدید مخالف ہیں جنید کی اس تعریف کو پسند کیا ہے اور لکھا ہے کہ "اگر صوفیہ جنید کی اس تعریف کو ہمیشہ مدنظر رکھیں کہ قدیم اور حادث میں ایسا فرق ہے جو کبھی زائل نہیں ہو سکتا (مطلب یہ ہے کہ قدیم کبھی حادث نہیں بن سکتا اور حادث کبھی قدیم نہیں بن سکتا) تو وہ اس گمراہی سے محفوظ رہ سکتے ہیں جس میں بعض صوفیہ گرفتار ہو گئے۔" (منہاج السنۃ جلد ۳ صفحہ ۸۴)

جنیدؒ نے اپنے اکثر رسائل میں توحید کے مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ مثلاً رسالہ نمبر ۲ میں وہ لکھتے ہیں "جان لو کہ توحید بنی آدم میں چار مراتب میں پائی جاتی ہے۔ مرتبۂ اول: عوام الناس کی توحید۔ مرتبۂ دوم: علماء کی توحید۔ مرتبۂ سوم و چہارم: عرفانی توحید (یا یوں کہو کہ صوفیہ اور اخص الخواص کی توحید)"

اگرچہ متکلمین توحید کے ان مراتب کو تسلیم نہیں کرتے مگر امام غزالیؒ نے اس نظریے کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ ہر شخص کی اخلاقی اور نفسیاتی حالت دوسروں سے مختلف ہوتی ہے اس لئے مراتب کا وجود قرین عقل ہے۔

جنید نے خود بھی اس نظریے کو نفسیاتی اور اخلاقی زاویۂ نگاہ کی روشنی میں حل کیا ہے ان کا حل فلسفیانہ استدلال پر مبنی نہیں ہے بلکہ انسانوں کی باطنی اور نفسیاتی حالت سے گہری واقفیت اور فطرتِ انسانی کے عمیق مطالعے پر مبنی ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کی فکری تاریخ میں جنید سے پہلے کسی کی اس نکتے تک رسائی نہیں ہو سکی۔ اسی بنا پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ جنید ایک عارف ہی نہیں تھے حکیم (فلسفی) بھی تھے اور ان کے محدث، فقیہہ اور مفسر ہونے کا اعتراف تو سبھی نے کیا ہے لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ باعتبار علم ظاہری و باطنی تمام متقدمین کے سرتاج ہیں۔

جنیدؒ نے اپنے مختلف رسائل میں توحید کے ان مراتب اربعہ کی جو شرح کی ہے۔ اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

(۱) توحیدِ عوام: "عوام کی توحید یہ ہے کہ وہ اللہ کو ایک جانتے ہیں اس کے سوا کسی کو خدا نہیں مانتے کسی کو اس کا شریک، سہیم، ہمسر، مقر مقابل یا مثیل نہیں قرار دیتے مگر خدا کے علاوہ دوسروں سے امیدیں بھی رکھتے ہیں اور ڈرتے بھی ہیں۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا عقیدۂ توحید ناقص ہے اگر کامل ہوتا تو وہ نہ غیر اللہ سے خوف کھاتے۔ نہ امیدیں وابستہ کرتے۔ توحید کامل کی بدولت غیر اللہ کا تصور اسی طرح دل سے محو (غائب) ہو جاتا ہے جس طرح طلوعِ آفتاب سے ستارے غائب ہو جاتے ہیں۔ (کتاب اللمع صفحہ ۳۱)

(۲) **توحیدِ علماء** : جو لوگ دینی علوم میں رسوخ رکھتے ہیں وہ تصورِ عوام کے علاوہ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ اللہ کے سوا کائنات میں کوئی ہستی ایسی نہیں جو کسی دوسرے کو نفع یا نقصان پہنچا سکے اس لئے وہ کسی سے ڈرتے ہیں نہ امید رکھتے ہیں۔ (رسالہ ص۱۶)

(۳) **توحیدِ عرفا طبقۂ خواص** : ان حضرات کی توحید یہ ہے کہ وہ مذکورہ بالا طبقوں کے عقائد کے علاوہ جو احکام شریعت بجا لاتے ہیں ان کی بجاآوری کے وقت ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ خدا ہمیں دیکھ رہا ہے اور ہم اس کے سامنے حاضر ہیں (حضوری کا احساس ہوتا ہے) خدا ہمیں حکم دے رہا ہے اور ہم اس کی تعمیل کر رہے ہیں۔" (رسالہ ص۱۹)

مطلب یہ ہے کہ اس مرتبے میں سالک کو اپنی شخصیت اور انفرادیت کا احساس باقی رہتا ہے۔ اسے ابھی تک غیر اللہ کا شعور حاصل ہے خواہ وہ غیر اللہ اس کی اپنی ہی ذات کیوں نہ ہو۔

(۴) **توحیدِ عرفا طبقہ اخص الخواص** : توحید کی اس نوعِ اعلیٰ میں سالک اپنی شخصیت کو خدا میں محو کر دیتا ہے اور بحرِ وحدت میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں سالک کامل طور پر وحدتِ ذات کا تحقق حاصل کر لیتا ہے اور حقیقی معنی میں قرب و اتصال کی لذت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔" رسالہ ص۱۹

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مرتبے میں سالک اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی میں فنا کر دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خود ہی مجسم مشیتِ ایزدی بن جاتا ہے۔ اس کی ذاتی مرضی یا چاہت یا ارادہ باقی نہیں رہتا۔ صرف اللہ کا ارادہ باقی رہ جاتا ہے[1]

شیخ ہجویری نے اس مقام کی شرح یوں کی ہے "اس مقام میں موحد اپنی شخصیت اور ارادے کو بالکل محو کر دیتا ہے پس وہ اس ذرّے کی مانند ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ قبل تخلیق، میثاقِ توحید کے وقت تھا، جب اس نے "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کے جواب میں "بلیٰ" کہا تھا۔ نیز اس توحید کا مطلب یہ ہے کہ اس مقام میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال کے سامنے سالک کی شخصیت بالکل فنا ہو جاتی ہے اور اس صورت میں وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں بمنزلہ آلہ بن جاتا ہے۔ ایک ایسی شے جس کا اپنا ارادہ کچھ نہیں، فاعل اس سے جو چاہے کام لے اور اس کا جسمِ ظاہری دراصل اسرارِ خداوندی کا خزانہ بن جاتا ہے اور اس کے الفاظ اور افعال خدا ہی سے منسوب ہوتے ہیں۔" (کشف المحجوب صفحہ ۲۸)

توحید کا یہ چوتھا یا اعلیٰ مرتبہ جیسا کہ جنید خود کہتے ہیں ان کے نظامِ فکر کے دو نظریوں پر مبنی ہے :۔

(۱) نظریۂ میثاق : اس کا مطلب ہے وہ علاقہ یا رابطہ جو خدائے خالق اور بندۂ مخلوق کے درمیان ہے اور خدا کے حضور میں بندے کا تحقق، مقامِ خویشتن (اپنے مقام کا تحقق)

---

[1] چوں فنا اندر رضائے حق شود بندۂ مومن قضائے حق شود (اقبالؒ)
گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود (رومیؒ)

(۲) نظریۂ فنا : اس کا مطلب ہے بندے کا اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں بکلی ضم یا فنا کرکے اور اس کی حضوری محضہ میں حاضر رہ کر اللہ کی توحید کا تحقق۔

ذیل میں ایک نقشہ درج کیا جاتا ہے تاکہ مذکورہ بالا مباحث کا خلاصہ آنِ واحد میں ناظرین کے سامنے آ سکے۔

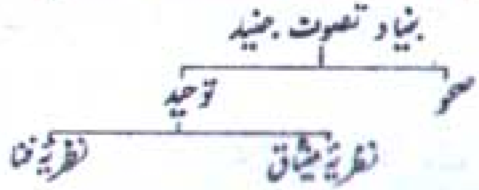

ان دو نظریوں کے سمجھ لینے کے بعد جنید کا نظریۂ توحید بخوبی سمجھ میں آ جائے گا۔

جنید کا نظریۂ میثاق

جنید نے صراحت کی ہے کہ "توحید کی آخری منزل میں عابد اپنی اس پہلی حالت کی طرف رجوع کرتا ہے جس میں وہ عالمِ خلق میں موجود ہونے سے پہلے تھا۔" (رسالہ ۱۶)

جنید کا عقیدہ یہ ہے کہ عالمِ آب و گل میں آنے اور اس جسمانی ہستی سے پہلے عابد کی ایک اور ہستی بھی تھی، جس کا ثبوت قرآن حکیم کی اس آیت سے مل سکتا ہے :۔

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ	اور جب کہ آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت
مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَ	سے ان کی ذریت کو نکالا اور ان سے انہی کے
هُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ	متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب
قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا (۷ : ۱۷۲)	نے جواب دیا ہاں بے شک ہم اقرار کرتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ ہمیں مطلع فرماتا ہے کہ اس نے اولادِ آدم سے اس وقت خطاب کیا جب وہ خارجی دنیا میں موجود نہ تھی۔ البتہ وہ علمِ خداوندی میں ضرور موجود تھی۔ لیکن یہ ہستی اس نوعیت کی ہستی نہیں ہے جو مخلوقات سے منسوب ہے اس کی ماہیت اور کیفیت فہمِ انسانی سے باہر ہے۔ اس کا صحیح علم تو صرف اللہ ہی کو حاصل ہے جب اللہ نے اولادِ آدم کو اپنے حضور میں طلب کرکے سوال کیا اور انہوں نے جواب میں "ہاں" کہا تو یہ اقرار یا اس کی صلاحیت بھی اللہ ہی کی طرف سے ایک تحفہ یا انعام تھا۔ دراصل یہ جواب بھی خدا ہی کی طرف سے تھا اور ارواحِ اولادِ آدم صرف اس (خدا) کے قول کی ناقل تھیں۔ خدا ہی نے ان ارواح کو اپنی ذات کا علم عطا فرمایا جبکہ وہ ہنوز اس (اللہ تعالیٰ) کے علم میں تھیں اور انہیں وجودِ خارجی حاصل نہیں ہوا تھا (صرف وجودِ علمی حاصل تھا) (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الغرض اس آیت سے ثابت ہے کہ اللہ نے اولادِ آدم سے اُس وقت خطاب کیا جب وہ خارج میں موجود نہ تھیں۔ (انہیں وجودِ خارجی حاصل نہ تھا) اللہ کے لئے یہ سوال اس لئے ممکن ہو سکا کہ وہ اولاد آدم کو ان کے وجودِ خارجی سے پہلے بھی دیکھ سکتا ہے؟ (رسالہ جنید)

پس جنید کی رائے میں ہستی دو قسم (نوع) کی ہے۔ ایک ہستیٔ ایزدی جو زمان و مکان سے بالاتر ہے اور دنیا میں آنے سے پہلے ہم کو وہی ہستی نصیب تھی (ہم علم باری میں ہست یا موجود تھے) دوسری اس عالم خارجی میں ہماری ہستی۔

"یہ ایزدی ہستی جس میں ہم تھے کامل ترین ہستی ہے۔ اس ہستی میں انسان کی انفرادیت ہستیٔ باری میں منہمک اور محو ہو جاتی ہے۔" (رسالہ ص۶)

"ہماری یہ پہلی ہستی ہی دراصل حقیقی ہستی یا وجود ہے۔" (رسالہ ص۵)

"لیکن اس ہستی کی نوعیت ہماری فہم سے بیروں ہے۔" (رسالہ ص۶)

"کون موجود تھا؟ اور وجود سے پہلے کون موجود ہو سکتا ہے؟ کیا خالص پاکیزہ اور مقدس ارواح کے سوا کوئی اور ہستی خدا کی قدرت و مشیت کا طرہ کے مطابق جواب دے سکتی تھی؟ (رسالہ ص۵)

خلاصہ کلام اینکہ بفحوائے تعلیم جنید

توحید کی آخری منزل میں سالک اسی حالت اصلی کی طرف عود کرتا ہے جس میں وہ قبل تخلیق موجود تھا۔ یعنی وہ اپنی مادی دنیاوی زندگی سے بکلی قطع تعلق کر لیتا ہے۔ اس کی عارضی انسانی زندگی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور اسی کی بدولت وہ خدا کی ہستی میں ضم ہو کر زندگی بسر کرتا ہے اس منزل پہ پہنچ کر جب سالک خدا کی ہستی میں بکلی جذب یا گم ہو جاتا ہے اس پہ توحید کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور وہ حقیقی معنی میں موحد بن جاتا ہے۔ نقوش اغیار اس کے پردہ چشم سے بکلی محو ہو جاتے ہیں۔ اسے ہر طرف خدا ہی خدا نظر آتا ہے۔ قوس قزح کے رنگوں میں، شفق کی سرخی میں، گلاب کی خوشبو میں، دریا کی روانی میں، بلبل کی نغمہ سرائی میں، صحرا کی وسعت میں، پہاڑ کی رفعت میں، بچے کی معصومیت میں، جوان مرد کی طاقت میں، عورت کی نزاکت میں، محب کے نیاز میں، محبوب کے ناز میں، کوئل کی کوک میں، عاشق کی ہوک میں، عاشق کی فریاد میں، معشوق کے تبسم میں، مؤذن کی اذان میں، پروہت کے ناقوس میں .... ہر جگہ اُسے خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اور وہ ہر شے میں خدا

---

[1] (حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ) اسی بات کو شیخ اکبرؒ نے "اعیانِ ثابتہ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ثبوت کی اصطلاح "وجود" کی ضد ہے۔ (مؤلف)

ہی کو دیکھتا ہے[1]۔ جب تک سالک کی ذاتی شخصیت برقرار رہتی ہے۔ من و تو کا امتیاز باقی رہتا ہے۔ وہ توحید کی اس اعلیٰ منزل تک نہیں پہنچ سکتا[2]۔ وجہ یہ ہے کہ جب تک اپنی انفرادیت کا احساس باقی ہے اس وقت تک دوئی باقی ہے۔ یعنی سالک کو یہ یقین ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی اور بھی (حقیقی معنی میں) موجود ہے۔ اور دوئی سالک کے لئے سب سے بڑی آفت ہے۔ جہاں دوئی ہے وہاں توحید کہاں[3]؟

جنید نے رسالہ ص۹ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ جب کسی بندے کو خلعت وجود عطا فرماتا ہے تو اس فعل سے پہلے وہ یہ فیصلہ فرما دیتا ہے کہ میں بندے پر غلبہ و تسلط کامل حاصل کروں گا اور اسے اپنی آغوش میں لے کر بحرِ وحدت میں اس طرح غرق کر دوں گا کہ دونوں "یک جان و دو قالب" ہو جائیں گے۔

شاید رومیؒ نے جب یہ شعر کہا تھا تو جنید کی یہی تعلیم ان کے پیش نظر تھی۔

ای دو تو بے من و تو جمع شوند از سر ذوق
خوش و فارغ ز خیالات پریشان من و تو (دیوان شمس تبریز)

چنانچہ جو لوگ بقول جنید اس دنیا میں اللہ کی مرضی پہ چلتے ہیں تو وہ انجام اپنی مرضی اس کی مرضی میں فنا کر دیتے ہیں اور مقام رضا پہ فائز ہو جاتے ہیں اور جب یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے تو سالک رمز توحید سے آشنا ہو جاتا ہے اور رمز توحید سے آشنا ہو کر تمام عقدہائے پیچیدہ خود بخود حل ہو جاتے ہیں اور انسان کو اطمینان قلب کی نعمت حاصل ہو جاتی ہے۔ شاید اقبال کے سامنے جنید ہی کی تعلیم تھی جب انہوں نے یہ شعر کہا تھا۔

برون کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقام رضا کشود مرا

بہر کیف جب سالک کو یہ حالت نصیب ہو جاتی ہے تو وہ جو کچھ کہتا ہے اور کرتا ہے وہ خدا ہی کی مرضی ہوتی ہے اور اسی کا فعل ہوتا ہے لیکن یہ مقام سالک کو خدا کی عنایت سے حاصل ہوتا ہے۔ جنید نے اس بات کو اس حدیث سے ثابت کیا ہے "میرا بندہ اعمال نافلہ کے ذریعے سے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ انجام کار میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب وہ میرا محبوب بندہ بن جاتا ہے تو پھر میں اس کا کان بن جاتا ہوں چنانچہ وہ میرے ذریعے سے سنتا ہے اور میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں اور وہ میرے واسطے سے دیکھتا ہے اور میں اس کا

---

[1] فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ۔ تم جدھر کو منہ کرو گے اسی طرف خدا کا منہ پاؤ گے۔

[2] ع پریم گلی اتی سانکری (تنگ) اس میں دو نہ سمائیں (مؤلف)

[3] از من و ما صنعت کردہ ایستی تو دست — ہست ایں جملہ خرابی از دو ہست (رومیؒ)
تو مباش اصلا کمال ایں است و بس — رو در و گم شو وصال ایں ست و بس

ہاتھ بن جاتا ہوں اور میرے وسیلے سے پکڑتا ہے۔ میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں اور وہ میری مدد سے چلتا ہے۔"

جنید نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے محبوب بندے کی ہر لحظہ تائید کرتا رہتا ہے اور اللہ ہر معاملے میں اس کی رہنمائی کرتا ہے جس کی بدولت وہ مقام صدق حاصل کر لیتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جو اس پر نازل ہوتا ہے۔ (رسالہ ص ۶)

جنید نے تصوف کی اس تعریف میں اسی حالت کو واضح کیا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ تصوف کی ماہیت یہ ہے کہ خدا بندے پر بندے کی حیثیت سے موت وارد کر دے اور پھر اپنی ذات میں اسے دوبارہ زندہ کر دے۔ (رسالہ قشیریہ صفحہ ۱۲۶)

وہ حالت کیا ہے جس میں بندہ اپنی ذاتی حیثیت کے اعتبار سے فنا ہو جاتے اور خدا میں زندہ ہو جاتے اور دوبارہ زندہ ہو کر زندگی بسر کرے؟ جنید نے اس سوال کا جواب اپنے نظریۂ فنا میں دیا ہے جسے آئندہ فصل میں بیان کیا جائے گا۔

جماعتِ اسلامی

- کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی؟
- آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے؟
- قیامِ پاکستان کے بعد اس نے کیا طرز عمل اختیار کیا؟
- اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

تحریک جماعتِ اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

ڈاکٹر اسرار احمد، ایم اے۔ ایم بی بی ایس

سابق ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیۃ طلبا پاکستان و امیر جماعت اسلامی منٹگمری

ضخامت ۲۳۶ صفحات، سائز بڑا، طباعت آفسٹ مجلد مع گرد پوش

قیمت چار روپے۔ علاوہ محصول ڈاک

دار الاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ، اسلام پورہ (سابق کرشن نگر) لاہور

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ

تا کہ حق کو حق ثابت کر دے اور باطل کو باطل (سورۃ انفال)

اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدعا اور طریق کار

ہمارے تحقیقِ اسلامی کے اداروں کے سامنے کرنے کا اصل کام

تالیف

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ

"........محترم ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کے اس مقالے سے میرے دل کو سب سے زیادہ اطمینان حاصل ہوا ہے۔۔۔میرے نزدیک اسلامی ریسرچ کا صحیح تصور یہی ہے جو اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے........"

مولانا امین احسن اصلاحی

"........اس موضوع پر میری نظر سے اس سے زیادہ تشفی بخش تحریر اب تک نہیں گزری........ اسلامی موضوعات پر کام کرنے والوں کے لئے یہ کتابچہ ایک دستور العمل کا درجہ رکھتا ہے........"

ڈاکٹر سید عبداللہ، سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

قیمت قسم اعلیٰ: ڈیڑھ روپیہ، قسم ادنیٰ: ایک روپیہ، محصولڈاک اس کے علاوہ

شائع کردہ:

دار الاشاعت الاسلامیہ

کوثر روڈ۔ اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور-1 (فون 69522)